# پاکستانی سیاسی آپ بیتیوں میں سیاسی، سماجی شعور کا تقابل

## ("فرزند پاکستان" اور "ہم بھی وہاں موجود تھے" کے حوالے سے)

مقالہ برائے ایم۔ فل (اردو)


مقالہ نگار:

محمد حماد اللہ




نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد


دسمبر ۲۰۱۹ء

# پاکستانی سیاسی آپ بیتیوں میں سیاسی، سماجی شعور کا تقابل

## (”فرزند پاکستان“ اور ”ہم بھی وہاں موجود تھے“ کے حوالے سے)

مقالہ نگار:

**محمد حماد اللہ**

یہ مقالہ

**ایم۔فل (اردو)**

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگو یجز

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

دسمبر ۲۰۱۹ء

# مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے۔ وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **پاکستانی سیاسی آپ بیتیوں میں سیاسی، سماجی شعور کا تقابل**

پیش کار: محمد حماد اللہ رجسٹریشن نمبر: MP-URDU-AF16-ID-004

## ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان و ادب

ڈاکٹر نازیہ ملک ____________________

نگران مقالہ

ڈاکٹر محمود الحسن رانا ____________________

شریک نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر ارشد محمود ____________________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈیئر محمد ابراہیم ____________________

ڈائریکٹر جنرل

____________________

تاریخ

# اقرار نامہ

میں محمد حماد اللہ حلیفہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر نازیہ ملک اور ڈاکٹر محمود الحسن رانا کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ ہی آئندہ کروں گا۔

______________________

محمد حماد اللہ

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

# فہرست ابواب

# Abstract

**Title:**

**The Comparison of political and social intellect and understanding in Pakistani political auto-biographies. ("Farzand-e-Pakistan" and "Hum Bhe Wahan Mujood Thay").**

**Abstract:**

The thesis contains the comparison of political and social intellect and understanding of Pakistani political auto-biographies.

Auto-biographies is a well-known and well-regretted genre of Urdu literature. In the auto-biography a person down important events of his life. In reality, he documents his personal life in it. This thesis consists of the auto-biographies of two well-known politicians. One is Sheikh Rasheed Ahmed's auto-biography "Farzand-e-Pakistan" the other is Abdul Majeed Malik's auto-biography "Hum Bhe Wahan Mujood Thay".

This thesis present a comparison of the Art and Style of the auto-biographies of both these political personalities. The subject of this thesis is documented and historical. During research of the thesis, the help from political and social history of Pakistan has been sought. As a result of this research, an understanding about the policies of Pakistani government and the ways and work of the politicians have developed and it has helped in understanding the national politics as well.

This thesis consists of five chapters. First chapter deals with, what is and auto-biography, its basic structure and arguments and background study of political auto-biographies in Pakistan along with it.

In the second chapter, the political caliber and understanding of both the politicians has been discussed and their comparison has been made in the political perspective.

In the second chapter, the work has been done on the social intellect and understanding of both the politicians, Sheikh Ahmed and Abdul Majeed Malik.

The Fourth chapter deals with the comparison of Art and Style of Writing of both the books. “Farzand-e-Pakistan and Hum Bhe Wahan Majood Thay”.

In the Fifth chapter, an overall whole some comparison has been made and presented in this thesis.

# اظہارِ تشکر

الحمد اللہ رب العالمین۔

اوّل حمد و ثنا اور کبریائی کے تمام لائق ہے صرف اور اور صرف وہی وحدہ لاشریک کہ جس کی مہربانی اور کرم کے طفیل میں اس مقالے کی تکمیل تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔

درود و سلام واسطے جناب ختم المرتبت محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے۔

اللہ تعالیٰ کی مجھ خاکسار پر بے انتہا نوازش ہوئی کہ مجھے اپنا ایم فل اردو کا تحقیقی مقالہ مکمل کرنے کے قابل ہوا۔ تحقیق ایک دشوار گزار کام ہے اور اس کے لیے پختہ عزم وارادے اور ہمت و حوصلے کے ساتھ ساتھ مناسب وسائل و ذرائع اور پر سکون ماحول درکار ہوتا ہے۔

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز کے شعبہ اردو کے قابل صد اساتذہ کرام کی علمی رہنمائی کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جن کی معاونت کے بغیر یہ مرحلہ تحقیق طے نہ ہو پاتا۔ شعبہ اردو کے تمام اساتذہ کرام بالخصوص ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر عابد سیال، ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر، ڈاکٹر نازیہ یونس، ڈاکٹر صائمہ نذیر، ڈاکٹر رخشندہ مراد، ڈاکٹر بشریٰ پروین، ڈاکٹر صوبیہ سلیم، ڈاکٹر فوزیہ اسلم، نگران مقالہ ڈاکٹر نازیہ ملک صاحبہ اور شریک نگران ڈاکٹر رانا محمود الحسن صاحب کی قدم قدم پر رہنمائی حوصلہ افزائی اور فنی معاونت شامل حال نہ ہوتی تو اس مقالے کی تکمیل ممکن نہ ہوتی۔

موضوع کے انتخاب سے لے کر مقالے کی تکمیل تک ہر لمحے ان کا تعاون حاصل رہا۔ یہاں تک کہ مواد کی فراہمی کے لیے بھی ان کی معاونت حاصل رہی۔

میں اپنے تمام اساتذہ اور احباب کا شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے میری مدد کی اور تعلیمی مرحلے طے کرنے میں میری رہنمائی کی۔ میں اپنے والد محترم حافظ روح الامین تنگوانی صاحب اور اپنی والدہ محترمہ کا اور اپنی بہن اور

اپنے بھائیوں محمد جمال اللہ تنگوانی اور حافظ عبد الرب تنگوانی کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے ہر موقع پر میرا حوصلہ بڑھایا اور اس کے ساتھ ساتھ میں اپنے دوستوں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جن میں سے زبیر احمد خان زور، محمد اجمل خان دستی، رانا شاہد تنویر ملک چھجڑا، اشرف گورمانی، ارشد توقیر چوہدری، جلیل بلوچ، عبدالمجید تنکانی، ڈاکٹر عبدالشکور کھوسہ، نعمان اسلم کلیانی، وسیم عباس خٹک جن کا بھرپور تعاون اور حوصلہ افزائی راقم کے ساتھ رہی۔

محمد حماد اللہ

اسکالر ایم فل اردو

## باب اول:

# موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

## الف: تمہید

### i) موضوع کا تعارف:

یہ تحقیقی مقالہ پاکستانی سیاسی آپ بیتیوں میں سیاسی، سماجی شعور کے تقابل پر مشتمل ہے۔ آپ بیتی اردو ادب کی ایک معروف اور معتبر صنف ہے اور اس کو خود نوشت بھی کہتے ہیں۔

(Auto Biography) بھی کہا جاتا ہے اور اس میں کوئی بھی فرد اپنی زندگی کے اندر رونما ہونے والے واقعات اور ان واقعات سے ہونے والے احساسات، تجربات اور مشاہدات کو قلمبند کرتا ہے۔ حقیقت میں وہ اپنی زندگی کے اندر رونما ہونے والے اہم واقعات کی تاریخ مرتب کرتا ہے۔

مجوزہ تحقیقی مقالے میں میں نے "فرزند پاکستان" اور "ہم بھی وہاں موجود تھے" کا تقابل اور ان کے سیاسی، سماجی شعور اور فن واسلوب کے حوالے سے مطالعہ کیا ہے۔

یہ تحقیقی مقالہ دو سیاسی شخصیات شیخ رشید احمد اور عبدالمجید ملک کی آپ بیتیوں پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں شخصیات پاکستان کی سیاست میں اہم کردار کی حامل ہیں۔

### ii) بیان مسئلہ:

سیاسی شخصیات کی آپ بیتیاں پاکستان میں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ مذکورہ تحقیق میں شیخ رشید احمد اور عبدالمجید ملک کی آپ بیتیوں میں سیاسی وسماجی شعور اور فن واسلوب کا تقابل کیا گیا ہے جس سے آپ بیتی نگاروں کے ہاں سیاسی وسماجی حوالے سے کیا کیا اشتراکات واختلافات ہیں اس کو بیان کیا گیا ہے۔

### (iii مقاصد تحقیق:

- پاکستان میں سیاسی آپ بیتیوں کی روایت بیان کی گئی ہے۔
- دونوں آپ بیتیوں میں سیاسی و سماجی شعور اور فن و اسلوب کا تقابل کیا گیا ہے۔
- تقابل کے طریقہ کار کو مد نظر رکھتے ہوئے دونوں آپ بیتیوں میں اشتراکات اور اختلافات کو بیان کیا گیا ہے۔

### (iv تحقیقی سوالات:

مجوزہ تحقیق کے دوران درج ذیل تحقیقی سوالات سامنے ہیں:

- پاکستان میں سیاسی آپ بیتیوں کی روایت کیا ہے؟
- فرزندِ پاکستان اور ہم بھی وہاں موجود تھے میں سیاسی و سماجی شعور اور فن و اسلوب کے حوالے سے اشتراکات اور اختلافات کیا ہیں؟
- ملک کے سیاسی و سماجی حالات و واقعات کو دونوں شخصیات نے کس زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے ؟

### (v نظری دائرہ کار:

پاکستانی سیاسی آپ بیتیوں کا سیاسی، سماجی پہلوؤں سے احاطہ کیا گیا ہے۔ جس سے اس تحقیقی مقالے میں پاکستان کے سیاسی اور سماجی حالات کو سمجھنے میں مدد ملے ہے۔ دونوں آپ بیتی نگاروں کا سیاسی و سماجی نقطہ نظر سے ملکی حالات کو دیکھنے کا زاویہ سامنے آیا ہے اور شخصیات کے ہاں موجود اشتراکات و اختلافات واضح ہوئے ہیں۔

### vi) تحقیق طریقہ کار:

مذکورہ تحقیق کا موضوع دستاویزی اور تاریخی ہے۔ اس لیے موضوع پر تحقیقی کام کے لیے پاکستان کی سیاسی تاریخ سے استفادہ کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انٹرویو، رسائل و جرائد، اخبارات، تبصروں اور تجزیوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔

### vii) موجودہ موضوع پر ماقبل تحقیق:

پاکستانی سیاسی آپ بیتیوں میں سیاسی، سماجی شعور اور فن واسلوب کے تقابل کے حوالے سے کوئی کام نہیں ہوا ہے البتہ آپ بیتیوں کے حوالے سے درج عنوانات کے تحت کام ہو چکا ہے:

- ملتان کے تین سیاستدانوں کی خود نوشتوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (یوسف رضا گیلانی، جاوید ہاشمی اور صاحبزادہ فاروق علی)
- انگریزی ادب میں In the Line of Fire and the Daughter of East کے تقابل پر کام ہو رہا ہے۔
- اردو ادب کی آپ بیتیاں تحقیقی و تنقیدی جائزہ

### viii) تحدید:

میں نے دو پاکستانی سیاسی شخصیات شیخ رشید احمد اور عبدالمجید ملک کی آپ بیتیوں کو لیا ہے جن پر تاحال کام نہیں ہوا۔ میرا موضوع ان کا سیاسی و سماجی شعور اور فن اسلوب کے تقابل پر مشتمل ہے۔

### ix) پس منظری مطالعہ:

پس منظری مطالعہ کے طور پر زیر تحقیق آپ بیتی نگاروں سے قبل کی آپ بیتیوں اور اس سلسلے میں لکھی گئی تنقیدی کتب کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں مجوزہ موضوع کی سیاسی شخصیات کے معاصر پر تحریر کیے گئے مضامین تبصرے اور تجزیے بھی پس منظری مطالعے میں شامل کیے گئے ہیں۔

### x) تحقیق کی اہمیت:

اس تحقیق سے پاکستانی حکومتوں کی پالیسیوں، سیاستدانوں کے کردار کی مدد سے پاکستان کے سیاسی اور سماجی حالات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے اور پاکستان کی قومی سیاست کو سمجھنے میں مدد ملی ہے۔

## ب: آپ بیتی کیا ہے؟ بنیادی مباحث

### تعارف: آپ بیتی، خودنوشت

روزِ اول سے ہی انسان اپنے تجربات اور مشاہدات کو اپنی اگلی نسل تک پہنچانے کی تگ ودو میں رہا ہے۔ جدید دور میں یہ چیزیں آپ بیتی سرگزشت اور خودنوشت کی صورت میں سامنے آئی ہے۔

افسانہ، داستان اور ناول بھی زندگی کے چند پہلوؤں کو دوسرے انسانوں تک تحریر کی صورت میں پہنچانے کی کوشش ہے۔ سفرنامہ بھی اس صنف کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔ مذکورہ بالا بیان کیے گئے نثری ادب کے تمام اصناف، انسانی تجربات کو مختلف انداز میں بیان کی سعی ہے۔

آپ بیتی سے قبل اردو ادب میں داستان اور کہانیاں دنیا کے باقی دیگر زبانوں کے ادب کی طرح موجود رہی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج وہ پہلا ادارہ تھا جس نے فرضی واقعات کو داستان کی صورت میں لکھنے والوں میں معرض تحریر میں آئیں۔

آپ بیتی سے قبل اردو ادب میں سوانح نگاری فروغ پاچکی تھی۔ اس کی ضرورت اس طرح محسوس کی گئی کہ کوئی انسان کسی کی زندگی پر کوئی کتاب ضرور لکھ سکتا ہے مگر وہ کتاب ذاتی تجربات اور مشاہدات کے مظاہر سے خالی رہتی ہے۔ لہٰذا خودنوشت آپ بیتی میں اُن عناصر کو پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس کی کمی سوانح نگاری میں رہ جاتی ہے۔ آسان الفاظ میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سوانح حیات کسی اور شخص کی آپ کی شخصیت کے بارے میں مفصل رائے کہی جاسکتی ہے مگر اس کے برعکس آپ بیتی میں آپ اپنی شخصیت کے خود نقاد ہوتے ہیں۔ زندگی کے اچھے برے پہلو اور تجربات کو دوسروں کے سامنے رکھتے ہیں۔

انسان کا اپنی زندگی کے حالات وواقعات کو خود قلمبند کرنا آپ بیتی کہلاتا ہے۔ اس کی ہر زبان وادب میں ایک خاص اہمیت ہے یہ اردو ادب کی نثری اصناف میں ایک معروف ومقبول صنف ہے۔ اس کو خودنوشت بھی کہا جاتا ہے۔ انگریزی زبان وادب میں اس کو آٹو بائیو گرافی Auto Biography کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ فرد واحد کی کہانی ہوتی ہے۔ جس میں اُس نے ذاتی زندگی کے تمام پہلوؤں کو واضح اور صاف الفاظ میں بیان کیا ہوا ہوتا ہے اور اپنی زندگی کے نشیب وفراز کی (داستان) کہانی بیان کی ہوئی ہوتی ہے۔ اس میں قارئین کی دلچسپی کے ساتھ ساتھ آپ بیتی نگار کے تجربات ومشاہدات میں دوسروں کے لیے رہنمائی بھی ہوتی ہے۔

## آپ بیتی نگار کی خصوصیات:

۱۔ اُس کی زندگی جدوجہد سے تعبیر ہو۔

۲۔ اُس کو زندگی کے حالات واقعات کو بیان کرنے کا فن آتا ہو۔

۳۔ معروف شخصیت ہو اور لوگ اُس کے متعلق مزید جاننا چاہتے ہو۔ سادہ الفاظ میں اگر یوں کہا جائے کہ اُس کا معروف شخصیت بننے کی وجوہات کا جو سفر ہے اُس کے متعلق آگاہی ہو۔

۴۔ جس عہد سے اُس کا تعلق ہے اُس عہد میں اُس کی کوئی حیثیت ہو۔ اُس کے کچھ چاہنے والے ہوں۔

## آپ بیتی کے حوالے سے ناقدین کی رائے:

آپ بیتی کسی شخص کی ایسی داستان حیات کو کہتے ہیں جسے اُس نے خود قلم بند کیا ہو۔ زبان وادب کے مختلف دانشوروں اور ماہرین لغات نے اس نثری صنف ادب کی مختلف تعریفیں پیش کی ہیں۔

مولوی فیروز الدین کے بقول:

”آپ بیتی اپنی کہانی اپنا حال خودنوشت حالات زندگی۔“ [1]

آپ بیتی ایک ایسی کہانی ہوتی ہے جس میں مصنف اپنی ذاتی زندگی کے حالات و واقعات کو قلمبند کرتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کا خود ہی مصنف، مبصر اور نقاد ہوتا ہے۔

فرہنگ تلفظ کے مطابق:

"آپ بیتی، ذاتی سرگزشت، جگ بیتی۔" [۲]

کسی بھی فرد کو زمانے میں زندگی گزارنے کیلئے واسطہ پڑتا ہے۔ آپ بیتی جس کو ذاتی سرگزشت یا جگ بیتی بھی کہا جاتا ہے اس میں انسان پر زندگی میں جو بیتی ہوتی ہے اس کو بیان کیا جاتا ہے۔

جس سے یہ ثابت ہوا کہ گزرے ہوئے حالات واقعات کا بیانیہ آپ بیتی کہلاتا ہے۔

اُردو انگلش ڈکشنری:

"The Story of One's Own Experiences Autobiography."[۳]

دی پینگوین ڈکشنری آف لٹریری ٹرمز اینڈ لٹریری تھیوری میں یہ الفاظ درج ہیں:

"Autobiography: An account of person's life by himself. "[۴]

آپ بیتی میں کوئی بھی فرد اپنے ذاتی، اچھے اور برے لمحات کے تجربات اور مشاہدات کو قلمبند کرتا ہے۔

سوانحی ادب میں خودنوشت آپ بیتی ایک مقبول و معروف اور معتبر صنف ہے۔ یہ فرد واحد کے گزرے ہوئے لمحات کا ایک دستاویزی ریکارڈ ہوتا ہے۔ یہ وہ دستاویزی ریکارڈ ہوتا ہے جو زندگی تمام پہلوؤں کا ایک منظم اور مربوط مجموعہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے بقول:

''اپنی زندگی کے احوال وواقعات کا بیان آپ بیتی کہلاتا ہے۔ اسے خود نوشت (Autobiography) بھی کہہ سکتے ہیں۔ آپ بیتی محض احوال وواقعات کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ اکثر اوقات لکھنے والے کے داخلی کیفیتوں دلی، احساس، شخصی اور عملی تجربوں زندگی کے جذباتی پہلوؤں اور بحیثیت مجموعی زندگی کے بارے میں اُس کے نقطہ نظر کی ترجمانی کرتی ہے۔''(۵)

آپ بیتی صرف حال واحوال کی کہانی نہیں ہوتی بلکہ اس کہانی کو قلمبند کرنے والے کی زندگی کے تمام پوشیدہ پہلو سامنے آتے ہیں اور اس فرد کی زندگی کے نقطہ نظر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور آپ بیتی کسی فرد کی ذاتی زندگی کے تلخ تجربات کا نچوڑ ہوتی ہے۔

وہاج الدین علوی کے بقول:

''خودنوشت سوانح حیات ادب کی تخلیقی صنف ہے۔ جو کسی فرد واحد کی زندگی کے تمام ادوار پر محیط ہوتی ہے اور اس کے قلم کی رہن منت ہوتی ہے۔ جس کے آئینے میں اُس فرد کی داخلی اور خارجی زندگی کا عکس براہ راست نظر آتا ہے اور اس کا عہد بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔''(۶)

خودنوشت ادب کی ایک معروف اور معتبر صنف ہے۔ اس میں کوئی فرد اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کو قلمبند کرتا ہے۔ حقیقت میں وہ اپنی زندگی کی تاریخ مرتب کرتا ہے جس سے اس فرد کی زندگی کے پوشیدہ رازوں سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

محمد طفیل کے بقول:

''آپ بیتی کسی انسان کی زندگی کے تجربات ومشاہدات محسوسات نظریات اور عقائد کی ایک مربوط داستان ہوتی ہے۔ جو خود اُس نے کم وکاست اور راست قلم بند کر دی ہو جسے پڑھ کر اُس کی زندگی کے نشیب وفراز معلوم ہو اُس کے نہاں خانوں کے پردے اُٹھ جائیں۔ ہم اُس کی خارجی زندگی کے سوا اُس کی داخلی کیفیات کے حجرے میں بھی جھانک کر دیکھ سکیں۔''(۷)

اس میں ایک فرد کی زندگی کے گزرے ہوئے حالات وواقعات کو بیان ہوتا ہے جس کو اس نے خود قلمبند کیا ہوتا ہے۔ جس میں زندگی کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا بیان ہوتا ہے جس سے ایک فرد کی زندگی سے مکمل آگاہی ہو جاتی ہے۔ کسی بھی انسان کی ظاہری زندگی سے تو بہت سے لوگ واقف ہوتے ہیں لیکن آپ بیتی سے اس فرد کی زندگی کے پوشیدہ رازوں سے بھی قارئین کسی حد تک واقف ہو جاتے ہیں۔

آل احمد سرور کے مطابق:

> ''جینا ایک فن ہے اور آپ بیتی فن لطیف ہے۔ اس سے عہدبرآ ہونے کے لیے بڑی سچائی بڑے ریاض اور بڑے کھرے پن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا راستہ بھی پُل صراط کی طرح بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہوتا ہے۔''(۸)

ہر فرد کی زندگی شخصی اُتار چڑھاؤ (نشیب وفراز) کا ایک مربوط اور منظم ذریعہ ہوتی ہے جس کو صفحہ قرطاس پر لا کر اپنی کہانی بیان کرنا آپ بیتی کہلاتا ہے۔

انسان کا اپنے ذاتی حالات وواقعات کو قلم بند کرنا ایک مشکل کام ہوتا ہے۔ زندگی کے اندر چند واقعات ایسے ضرور ہوتے ہیں ۔ جس کو انسان بیان نہیں کرنا چاہتا۔ بسا اوقات ہر انسان اپنی ذات کے حوالے سے کسر نفسی یا مبالغہ سے کام لیتا ہے۔ حقیقی طور پر وہ آپ بیتی سب سے بہتر اور بہترین خودنوشت ہے۔ جس میں حالات وواقعات کو من وعن بیان کیا جاسے لیکن اس کے برعکس مشفق خواجہ کے مطابق:

> ''خودنوشت کا اصل مقصد انکشاف ذات ہیں لیکن سماجی قیود اور اخلاقی مفروضات اسے پردہ ذات بنادیتے ہیں۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ اپنے آپ کو چھپانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ خودنوشت سوانح عمری لکھ دی جائے۔''(۹)

آپ بیتی کا حقیقی مقصد اگرچہ زندگی کے تمام پہلوؤں کو واضح اور صاف بیان کرنا ہوتا ہے لیکن سماجی حالات وواقعات کی گھٹن اور معاشرتی دباؤ کی وجہ سے آپ بیتی نگار بہت سے ایسے واقعات کو بیان نہیں کرتا جس کے بیان کرنے سے اس کی زندگی پر منفی اثرات پڑیں۔ معنوی اعتبار سے آپ بیتی کی ہمہ گیر پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے۔

عبد المجید قریشی رقمطراز ہیں:

''آپ بیتی یا خود نوشت سوانح حیات جس کے اوراق میں انسان حیات مستعار کے مختلف ادوار کو بلا کسی تکلف اور تصنع کے، دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے کہ اُس نے کن حالات میں اس جہاں رنگ و بو میں آنکھیں کھولیں کس طرح وہ طفل شیر خوار سے لڑکپن کی منزل میں داخل ہوا۔ اُس کا زمانہ طالب علمی کیسے بسر ہوا۔ عروس شباب نے کیوں کر اُسے خوش آمدید کہا زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں نے کیسے اُس کا خیر مقدم کیا۔ اُن کے ساتھ تلخیاں، محرومیاں، ناکامیاں کیسے اُس کی راہ میں سنگ ہائے گراں بن کر حائل ہوئیں اور کس طرح وہ اِس گرداب بلا سے اپنی کشتی حیات کو بچاتا ہوا نکلا۔ زندگی میں کن آدمیوں سے اُس کا سابقہ پڑا اور اُن کے متعلق اُس کی آرا اور تاثرات کیا ہیں۔ اُس زمانہ کا طرز معاشرت اور رہن سہن کیسا تھا اور رسم و رواج کی کیا کیفیات تھی۔ غرض آپ بیتی کے روپ میں ایک دور کی ہماہمی اور گہما گہمی پوری طرح جلوہ گر ہوتی ہے۔''(۱۰)

آپ بیتی کے اندر انسان اپنی ذات کے متعلق اور اپنے گردونواح کے متعلق جن چیزوں سے اُس کا واسطہ پڑتا ہے سب ذکر کرتا ہے۔ اس میں کوئی بھی قلم کار اپنی ذاتی زندگی کے گزرے ہوئے لمحات کو بغیر کسی بڑھائی کے دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس میں وہ اپنے بچپن کے خاندانی حالات اور اس کے ساتھ ساتھ جس ماحول میں اس کی پرورش ہوئی اور اپنی تعلیم و تربیت اور زندگی کی ناکامیوں اور کامیابیوں کا ذکر اور ذاتی جدوجہد جس کے ذریعے اس نے کامیابی کا سفر طے کیا ان سب کا ذکر آپ بیتی کہلاتا ہے۔

## آپ بیتی کی ابتدا:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ ازل سے ہی انسان کو جستجو کی تلاش رہی ہے۔ قدرت نے انسان کو جن خوبیوں سے نوازا ہے۔ ان کو بروئے کار لا کر انسان اپنے

داخلی اور خارجی تجربات مشاہدات اور احساسات کا پیغام دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ جس کی وجہ سے فن آپ بیتی معرض وجود میں آئی۔ خود نوشت آپ بیتی لکھنے کا رواج خاصا پُرانا ہے۔ جب سے کائنات قائم ہوئی ہے اور انسان کُرہ ارض پر آیا ہے۔ آپ بیتی اتنی ہی قدیم ہے۔ جتنا کہ خود انسان ہے۔ ہر دود کے انسان کی خواہش رہی ہے کہ وہ اپنے حالات وواقعات سے آنے والی نسل کو آگاہ کرے۔ اس لئے فن آپ بیتی کا سہارا لیا گیا۔

علم الدین سالک کے بقول:

> ”آپ بیتی اتنی ہی پُرانی ہے جتنا کر خود انسان اس کا آغاز انسان کے آغاز کے ساتھ ہوا۔ زمانے کی گردش نے آپ بیتیوں کے نام ونشان مٹادیئے تاہم بعض زبانوں میں آج سے ہزارہ سال پہلے لکھی ہوئی آپ بیتیاں موجود ہیں۔“(۱۱)

آپ بیتی کے ابتدائی نقوش زمانے قدیم میں پیوست ہیں۔ آپ بیتی کی جو موجودہ شکل و صورت ہے۔ ابتدا میں ایسی ہر گزنہ تھی۔ بلکہ آپ بیتی کی موجودہ شکل وصورت اس کے ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے۔

## اُردو ادب میں آپ بیتی کا پس منظری مطالعہ:

انسان نفسیاتی طور پر ماضی پرست اور قدامت پسند وقع ہوا ہے۔ وہ نئ ایجادات اور اختراعات کو آسانی سے قبول نہیں کرتا۔ اکثر مائیں، دادیاں، نانیاں چھوٹے بچوں کو اپنی زندگی کے ماضی کے واقعات کو دلچسپی سے سناتی ہیں۔ شاید یہی رویہ ترقی پا کر آپ بیتی کی صورت میں مختلف زبانوں کے ادب میں رواج پاچکا ہے۔ آپ بیتی اردو کے علاوہ فارسی، عربی اور دیگر مشرقی زبانوں میں بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ روسی، انگریزی، فرانیسی اور جرمن زبانیں ادب کی اس صنف کے حوالے سے مضبوط روایت کی حامل ہیں۔ جس طرح اُردو ادب میں مختلف اصناف دیگر زبان وادب سے آئی ہیں۔ اس طرح اردو ادب میں آپ بیتی بھی مختلف زبان وادب کے مجموعی اشتراک سے عمل میں آئی۔ اُردو ادب میں یہ صنف براہ راست انگریزی سے متاثر ہوئی۔

آپ بیتی پہلے سے موجود تھی۔ لیکن انگریزی ادب میں (AUTOBIOGRAPHY) کی اصطلاح باقاعدہ طور پر اٹھارویں صدی میں ہوئی۔

برصغیر کی تاریخ کے مختلف ادوار کا جائزہ لینے کیلئے ان ادوار میں لکھے گئے ادب کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔ ادب کا یہ مطالعہ نا صرف سماج اور رسم ورواج کو سمجھنے کیلئے ضروری ہوتا ہے بلکہ اس میں اکثر اوقات تاریخی حوالے بھی مل جاتے ہیں۔ جن سے آج کے دور تک کے انقائی سفر کو دیکھا جاسکتا ہے۔ یوں تو ۱۸۰۰ء میں برصغیر پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ مگر ان کی حکومت کو ختم کرنے کیلئے درپردہ بہت ساری کوششیں ہو رہی تھی۔ ان کوششوں کا نتیجہ نصف صدی بعد ۱۸۵۷ء میں آیا۔ جب برصغیر کے باسیوں نے انگریز حکومت ختم کرنے کے لیے جنگ آزادی شروع کی۔ جس میں مُسلمانوں کو ناکامی ہوئی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد مختلف لوگوں نے اُس وقت دلی اور ہندوستان کے دیگر علاقوں کی آپ بیتیاں لکھیں۔ یہ آپ بیتیاں بعد میں چھاپی گئیں۔ ان آپ بیتیوں کی مدد سے نا صرف برصغیر میں اردو آپ بیتی کے آغاز کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ بلکہ ارتقائی لحاظ سے زبان اور تاریخی حوالوں کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

آپ بیتیوں کی مدد سے افراد کی مجموعی سوچ اور رائے کے بارے میں صحیح صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اُردو ادب میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد اس صنف ادب کے آغاز میں مولانا جعفر تھا نیسری کی آپ بیتی تواریخ عجیب (کالا پانی) جو ۱۸۵۸ء میں سامنے آئی۔ اس کو اولیت کا درجہ دیا جاتا ہے۔ یہ اُردو کی پہلی باقاعدہ آپ بیتی ہے۔

علم الدین سالک کے بقول:

> "ہمارے یہاں آپ بیتیوں کا رواج ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد شروع ہوا۔ جس قدر ملک ترقی کرتا گیا اسی قدر زیادہ آپ بیتیاں لکھی جاتی رہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے آپ بیتی جو اُردو زبان میں لکھی گئی وہ "مولانا جعفر تھانیسری کی کالا پانی ہے"۔ [۱۲]

بعض لوگوں نے مولانا جعفر تھانیسری کے "کالا پانی" نواب صدیق حسن بھوپالی کی "البقاء المنن بالقاالمحمن" کو پہلی آپ بیتی قرار دیا ہے۔ اس آپ بیتی پر بہر حال مولانا جعفر تھانیسری کی آپ بیتی کو فوقیت دی جاسکتی ہے۔ جنھوں نے ایک نامور مُجاھد ہونے کے ناطے ظلم کے ضابطوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے "کالا پانی" میں قید و بند کے واقعات صراحت سے تحریر کیے ہیں۔ ان کی داستاں خود نوشت کے منظر عام پر آنے کے بعد اور کئی داستانیں منظر عام پر آئیں۔ جن میں منشی محمد عنایت حسین اور ظہیر دہلوی کی داستانیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ ظہیر دہلوی کی خود نوشت کے حوالے ڈاکٹر ندیم کے بقول:

"وہ ظہیر دہلوی اپنی زندگی کے مکمل حالات بیان نہیں کرتے۔ اسی لیئے ہم اُسے مکمل خود نوشت نہیں کہہ سکتے البتہ اسلوب اور زبان کے لحاظ سے ہی نہیں منظر نگاری کے نقطہ نظر سے بھی داستان غدر ایک اچھی خود نوشت ہے۔"[۱۳]

اردو ادب میں آپ بیتی کی روایت اتنی پُرانی نہیں ہے۔ البتہ تسلی بخش ضرور کہی جاسکتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سوانح عمُری کی روایت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جارہی ہے ابتدا اسے لے کر عہد حاضر تک اردو ادب میں لکھی جانے والی یہ آپ بیتیاں اُردو ادب کا بیش قیمت نثری سرمایہ ہیں۔

آپ بیتی کے آغاز وارتقاء میں صوفیائے کرام کے ملفوظات بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اشاعت دین کے حوالے سے جب وہ اجتماعات سے گفتگو کرتے اور شعائر اسلام بیان کرتے تو کچھ (مقربین) سننے والے ان کے تعلق دار احباب ان کے چاہنے والے ان کی تقریر کے اہم واقعات کو قلم بند کر لیتے تھے پھر اُس کی چھان بین کر کے مسودات تیار کر لیے جاتے تھے اور وہ خود بھی اُن کی تصدیق فرما دتیے تھے پھر ان ملفوظات کو عوام الناس تک پہنچا دیا جاتا تھا۔ اس طرح تبلیغِ دین کے حوالے کئی گئی کاوشوں کے ثمرات آنے والی نسلوں تک منتقل ہوتے رہتے تھے۔

## مختلف اصناف میں آپ بیتی کے عناصر:

روز اول سے ہی انسان اپنی تخلیق اور احساسات کے متعلق متجسس رہا ہے۔ ابتداء میں انسان عناصر فطرت سے ہم آہنگ تھا۔ اس لیے اُس نے اپنے اردگرد کی اشیاء سے متعلق اپنے تجسس کو دور کرنے کی کوشش اور انسان کا یہ تجسس اور فکرو تدبر ہی اُسے حیوانات کے زمرے سے ہٹا کر اشرف المخلوقات میں لا کھڑا کرتا ہے۔ اپنی اسی جبلی خواہش کے پیش نظر ہر زمانے میں ذات کے اظہار کے پیمانے موجود رہے ہیں۔ جن میں تخیر و تبدل وقت ماحول اور تہذیب کی وجہ سے ہے۔ مختلف نامور شخصیات نے ہر زبان وادب میں اپنے احساسات اور تجربات کا نچوڑ عوام الناس تک پہنچانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مختلف نامور شخصیات نے اپنے کارنامے عوام لناس تک پہنچانے کے لیے مختلف پیرائے اپنائے ہیں۔ لہٰذا مختلف انداز سے لکھے گئے۔ خطوط، تذکرے، سفر نامے، مثنویاں، روزنامچے انٹرویوز اور رپورتاژ ناول افسانہ یہ کسی نہ کسی طور پر آپ بیتی کے زمرے میں آتی ہیں۔ ان سب اصناف میں بھی مصنف کسی نہ کسی طور پر تجربات زندگی اور اظہار ذات کے پہلوؤں کو مد نظر رکھتا ہے۔

مختلف اصناف کی صورت میں آپ بیتیوں کے ابتدائی خدوخال کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ اصناف ادب کی ابتدائی صورتوں کا آپ بیتیوں کے جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

## ناول / افسانہ میں آپ بیتی کی جھلک:

ادب کی مختلف اصناف کے حوالے سے یہ عمومی رویہ بالا دست حثیت رکھتا ہے۔ کہ اس میں انسان نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی ذات اور سوچ کے اظہار سے باہر نہیں آسکتا ہر دور کے ادب میں قاری ہمیشہ اپنے مفاد اور دلچسپی کے عنصر کو مد نظر رکھتا ہے۔ اور اولین حیثیت دیتا ہے۔

یوسف جمال انصاری:

> ”اگر کسی ناول پر یہ درج ہو کہ یہ محض فرضی کردار کا افسانہ نہیں سچ مچ کی سرگزشت ہے۔ تو لوگ اُسے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ ناول افسانے کو سوانح عمری یا سرگزشت کہہ کر پکارنا عام تھا۔“[۱۴]

ناول اور افسانے کے مرکزی کرداروں کو عموماً اپنی ذات کے اظہار کے لیے مختص کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات جسمانی طور پر بھاگنے دوڑنے سے معذور لکھاری مرکزی کرداروں میں بھاگنے دوڑنے والے ایسے کرداروں کو پیش کرتے ہیں۔ جس میں اُن کی خواہش کی تکمیل ہو سکے۔ یعنی انسان اگر بظاہر اپنی منزل کو پا نہ سکے تو ناول افسانے میں اس طرح کے کردار سمو کر اپنی دبی خواہشات کی تکمیل کا وسیلہ تلاش کرتے ہیں۔ گویا ناول افسانہ بظاہر گھڑے ہوئے کرداروں کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ مگر درحقیقت اُن کے کرداروں میں انسانی نفسیات کی گتھیاں مختلف انداز سے سلجھتی ہیں۔

ڈاکٹر ندیم احمد خود نوشت میں موجود عنصر کے بارے میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اُن کے اسلوب میں ایک افسانوی انداز پایا جاتا ہے۔ خود نوشت میں اُس وقت کے دہلی کی تہذیب و تمدن کا رنگ و آہنگ شامل ہے۔ اُس کی ادبی تاریخی اہمیت آج بھی برقرار رہے۔ اور اُردو کی ابتدائی خود نوشت میں سر فہرست ہے۔''[۱۵]

اس بیان سے ایک تاثر یہ بھی اخذ ہوتا ہے۔ کہ قصے کہانی کے رنگ میں لکھے جانے والی آپ بیتیوں کو فنی لحاظ سے مضبوطی کی سند مل جاتی ہے۔ تو دوسری جانب اس طرح کی آپ بیتیوں کے لیے قارئین ادب کا ایک وسیع حلقہ ادیب کی تحسین کیلئے ہمہ وقت موجود رہتا ہے۔

## خطوط میں آپ بیتی کی جھلک:

خطوط ادب میں نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ اور زمانہ قدیم سے اظہار کا ایک موثر ذریعہ رہا ہے۔ اس میں نا صرف دوسروں کی خیر، خبر دریافت کی جاتی ہے۔ بلکہ ہجر، وصال، محبت، غم اُمید و یاس غرض کوئی بھی موضوع خطوط کے دائرے سے باہر نہیں تمام موضوعات پر خطوط میں اظہار خیال کیا جا سکتا ہے۔ دنیا کی تمام تہذیبوں اور معاشروں میں خطوط لکھنے لکھوانے اور پڑھنے کا رواج موجود رہا ہے۔ بالفاظ دیگر مکتوبات کو عالمی ادب کا مشترکہ ورثہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ خطوط کے معانی اور مفاہیم ایک مقصد کے تحت پڑھے جاسکتے

ہیں۔ مقصد اور مفہوم سے آگاہی ہوئے بغیر خطوط پڑھنے کے مفہوم کو نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ خطوط رومانوی ادب کے علاوہ دیگر مقاصد کو بھی پوار کرتے ہیں۔ برصغیر میں کئی چلنے والی تحریکوں کے پشت پر خطوط کے ذریعے اُن کے مقصد اور تحریک کے بانیوں کے مقصد کا تعین کرنے میں آسانی رہتی ہے۔ جنگ آزادی کے ناکام ہونے سے لے کر اب تک اردو میں خطوط کے کئی مجموعے سامنے آئے ہیں۔ جن میں نہ صرف تحریکوں کے متعلق مواد موجود ہے۔ بلکہ اُس کی وجہ اُن تحریکوں کے مقاصد کو اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

امروز بھی خطوط کی اہمیت کم نہیں ہوئی۔ البتہ ذاتی خطوط کا رواج ختم ہو چلا ہے۔ نئے آنے والے مواصلاتی آلات نے انسان کو ایک دوسرے سے حتی الامکان جوڑے رہنے کی سہولت فراہم کر دی۔ مگر جانب دیگر خطوط میں پائی جانے والی محبت، جُدائی کے گہرئے احساس اور رونق سے انسان کو بڑی حد تک محروم کر دیا ہے۔

خطوط کے تاریخی کردار کے حوالے سے اسلامی تاریخ اور دنیا کی دیگر تواریخ بھری پڑی ہیں۔ خطوط کے حوالے سے یہ بات اہم ہے۔ کہ اس کا مقصد لازمی ہوتا ہے۔ اور مقصد ہی موضوع اور انسانی ذہن کے بارے میں فکر کا واضع تعین کرتا ہے۔

علم الدین سالک کے بقول:

> ”ہمارے قدیم درس میں مکتوبات پڑھائے جاتے تھے ان مکتوبات کے مصنف جب اپنے ذاتی امور کی طرف اشارے کرتے ہیں۔ تو مکتوبات آپ بیتی کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے تاریخ کے بہت سے اُلجھاؤ دور ہوتے ہیں۔“[۱۲]

خطوط کی ابتدائی صورتیں آپ بیتی سے مشابہت نہیں رکھتی تھیں۔ بلکہ یہ اظہار و بیان ایسا وسیلہ تھا جس میں القابات اور تکلف کے دیگر پیرائے نفس مضمون پر فوقیت رکھتے تھے۔ غالب وہ پہلا شاعر تھا۔ جس نے تکلف بھری اس تکلیف کو راحت بھری کلفت میں تبدیل کر دیا۔ ان کے بقول انہوں نے خط کو مکالمے میں تبدیل کر دیا۔ ان کی بے تکلف اور تصنع سے آزاد نثر نے اردو کی نثری ترقی میں نئی راہیں تلاش کیں۔

غالب کے خطوط کئی وجوہات کی بناء پر اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک تو اُن کے خطوط سے ہم اُس وقت کے دہلی کے ابتر حالات اور عوامی زندگی کے بارے میں آگاہ ہو سکتے ہیں اور دوسری طرف ان خطوط کی مدد سے ہم اُن کی شخصیت افکار اور اُن کے میل جول کا پوری طرح انداز کر سکتے ہیں۔ غالب کے خطوط آسان اور بے تکلف نثر کی طرف بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئے۔

عجیب اتفاق یہ ہے کہ اُسی دوران سر سید بھی آسان نثر متعارف کرانے اور بے مقصد پر تکلف رویوں سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی تگ و دو میں تھے۔ تاکہ گھٹنوں کے بل چلنے والی نثر کو اپنے پاؤں پر کھڑا کر کے اُسے جدید سائنسی اور ادبی زبانوں کے صف میں کھڑا کیا جاسکے۔ یہ الگ بات ہے کہ مضامین اور خطوط لکھتے وقت لاشعوری طور پر ادیبوں نے اظہار ذات کو مرکز بنائے رکھا۔ خطوط کو آپ بیتی ان معنوں میں کہا جاسکتا ہے کہ زندگی کے مختلف پہلوؤں بالخصوص ادبی اور خاندانی زندگی کو ہم خطوط میں دیکھ سکتے ہیں۔ خطوط کی اہمیت آپ بیتی کے تناظر میں اس لیے بھی زیادہ ہے کہ بے تکلف دوستوں اور رشتہ داروں کو لکھے جانے والے خطوط میں ادیب کی زندگی کے وہ پہلو سامنے آتے ہیں جو عموماً ادب کی دیگر اقسام میں دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ مثلاً افسانہ ناول تحریر کرتے ہوئے ادیب چند پہلوؤں کو افسانوی رنگ میں بیان کرتا ہے جبکہ خطوط کے ذریعے ہم ادیب کے دوسروں کے ساتھ برتاؤ وغیرہ کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔ جیسے عموماً ادب کے دیگر اصناف میں جگہ نہیں ملتی۔ یا ادب کا کینوس ان موضوعات کو برداشت کرنے کا متحمل نہیں ہوتا۔ مندرجہ بالا باعث کو نظر میں رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خطوط دراصل ایک مخصوص اور مختصر وقت میں لیے ہوئے واقعات کے بارے میں مصنف کا نظریہ پوری وضاحت سے پیش کرتا ہے۔ اس کے برعکس آپ بیتی میں زندگی کے بڑے حصے کو استعمال میں لایا جاتا ہے۔ یوں خط اور آپ بیتی دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خط اور خود نوشت دراصل ایک ہی صنف کے دو پہلو ہیں۔ خط میں مصنف مختصر سے مختصر انداز اختیار کرتا ہے جبکہ آپ بیتی اس کے برعکس مفصل اور جامع ہوتی ہے۔ یوں معلومات کی کم یا زیادہ فراہمی مقصد اور نصب العین کی تبدیلی کی وجہ سے خط اور آپ بیتی دو اقسام میں تقسیم کی گئی ہیں مگر دراصل یہ ایک طرح کے اصناف ہیں۔ ذاتی خط کو مختصر آپ بیتی بھی کہا جاسکتا ہے۔

## روزنامچہ میں آپ بیتی کی جھلک:

روزنامچہ بالفاظ دیگر ڈائری روز مرہ میں ہونے والے حالات وواقعات کو یکے بعد دیگر روزانہ کی بنیاد پر تحریر کرنے کا نام ہے۔ معلومات زندگی کو درج کر کے لکھنا زمانہ قدیم سے اہم مشغلہ رہاہے۔ شاعر وادیب، مشغلہ سیاست دان، کاروباری حضرات اپنی ڈائری کو خود ترتیب دیتے ہیں۔ جس سے انہیں اپنے معمولات کو مرتب کرنے میں آسانی رہتی ہے۔ بعض سیاست دانوں جرنیلوں، اور سپہ سالاروں کی ڈائریاں ان کے گہرے مشاہدات اوران لوگوں کی پرکھ کے گواہ ہوتے ہیں۔ یہ بات قابل یقین ہے کہ آج کی دنیامیں یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ ہر انسان چاہے ان کی صورت ایک دوسرے سے مشابہہ کیوں نہ ہو فکر و تدبر کے حوالے سے ایک نئے زاویے کا مالک ہوتا ہے۔ مشاہدات اور زاویہ نگاہ کا الگ ہونا ہی ڈائریوں کے اندر معمولات زندگی کے اندراج میں تنوع پیدا کرتا ہے۔ انسان جہاں بہت ساری خوبیوں کا مالک ہے وہی کمزوریاں بھی رکھتاہے۔ یاداشت کی کمزوری انہی میں سے ایک ہے۔ ڈائری کا بنیادی مقصد آئندہ روز کے معمولات کو اس طرح ترتیب دینا کہ یاداشت کی کمزوری کے باعث کوئی اہم معاملہ زندگی حل کرنے سے رہ نہ جائے۔

یوسف جمال انصاری کے بقول:

> ”روزنامچے کی بہترین صورت وہ ہے جب لکھنے والا اپناروزنامچہ لکھے نہ کہ اشاعت کی غرض سے خودنوشت سوانح نگاری میں روزنامچے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے روزنامچے میں مصنف کے شب وروز کا ذکر خود اس کے قلم سے ہوتا ہے۔“[۱۷]

روزنامچے میں اندراج چونکہ انسانی سرگرمیوں کی یکسانیت کے بارے میں بتاتے ہیں۔ اس لیے اس میں پائی جانے والی یکسانیت اس کا بقیہ دیگر اصناف سے کم تر کر دیا ہے۔ البتہ انگریزی ادب میں اس کی ایک مضبوط روایت موجود ہے۔ آپ بیتی اور روزنامچے میں مماثلت اس طور پر پائی جاتی ہے کہ ہر دو اصناف خود ہی ادیب تحریر کرتا ہے اور دونوں میں ذاتی حالات وواقعات کا تذکرہ ہوتا ہے۔

آپ بیتی اور روناچے میں فرق یہ ہے کہ اوّل یہ کہ روزنامچے میں آپ بیتی کی سی طوالت اور ادبی چاشنی موجود نہیں ہوتی اور دوسرا یہ کہ اس میں انسان زیادہ تر آئندہ کے معاملات کو ڈسکس کرتا ہے اور ماضی کے بارے میں کم سے کم باعث کی جاتی ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ بیتی کے ابتدائی نقوش میں روزنامچہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ بلکہ کوئی شخص روزنامچے کی بنیاد پر سب سے بہتر آپ بیتی لکھ سکتا ہے۔

## تذکرہ میں آپ بیتی کی جھلک:

تذکرہ نویسی کا رواج اُردو ادب کے قدیم ترین رواجوں میں شمار ہوتا ہے۔ اُردو میں دستیاب اولین تذکروں میں تذکرہ نکات الشعرا خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ اُردو ادب میں کسی معلوم تاریخ میں پہلا تذکرہ ہے۔ اس میں میر نے اپنے دور سے پہلے کے شعرا کا ذکر اور نمونہ کلام درج کیے ہیں۔ میر کے علاوہ مصحفی، میر حسن، انشااللہ خان انشا اور شیفتہ تک تذکروں کا ایک طویل سلسلہ موجود ہے۔ مولوی عبدالحق، مرزا فرحت اللہ بیگ اور رشید احمد صدیقی نے اس صنف ادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے، قدیم شعرا کے تذکروں میں بیان کیے گئے حالات زندگی کسی حد تک سوانحی ادب سے مشابہت رکھتے ہیں اور یوں سوانحی ادب کے آغاز میں تذکروں کا اہم کردار رہا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بقول:

> ''ادبی تنقید کی طرح اردو میں ادبی سوانح نگاری کے ابتدائی نقوش بھی انہی تذکروں میں ملتے ہیں۔ چنانچہ قدیم شعرا کی زندگی اور سیرت و شخصیت کے متعلق جتنی کتابیں یا مقالات اب تک مرتب ہوئے ہیں یا ولی عہد سے یا انیسویں صدی کے اواخر تک شعرا کے متعلق جو حالات و واقعات سامنے آئے ہیں ان سب کا سرچشمہ یہی تذکرے ہیں۔''(۱۸)

اردو ادب میں موجود تذکروں میں ان تمام باتوں کے بارے میں صراحت سے ذکر نہیں کیا گیا ہے جو ایک اچھی آپ بیتی کا بنیادی خاصہ ہے۔ مگر اس کے باوجود تذکروں کی اہمیت سے کلی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ دراصل شعروں کے بارے میں ایسی معلومات ہیں جن سے ان کے عہد زبان وادب اور معاشرت کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ اس وجہ سے سوانحی ادب میں ان کی اہمیت پہلے سے دوچند ہو چکی ہے۔ کیونکہ یہی ایک راستہ ہے جس کی مدد سے ہم اُردو شاعروں کے زمانی حالات کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ اس امر کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ سوانحی ادب اولین حالت میں تذکروں کے بغیر کچھ نہیں ہے۔

## مثنوی میں آپ بیتی کی جھلک:

مثنوی ہر چند عربی زبان کا لفظ ہے مگر فارسی ادب میں مثنوی کی روایت خاصی قدیم ہے۔ فارسی میں مثنوی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ جدید فارسی کے آغاز میں ہی مثنوی میں شاعری کرنے والے بہت سارے شعر اشامل ہوئے۔ عربوں نے ایران پر سو برس حکومت کی۔ اس دور میں فارسی کا نا صرف رسم الخط تبدیل ہوا بلکہ عربی الفاظ اور محاورات فارسی زبان میں مستقل حیثیت اختیار کر لی۔ فارسی میں تاریخ کے ہر دور میں مثنوی میں شاعری کرنے والے پر گو شاعروں کی بہتات رہی ہے۔ سعیدی، شیرازی، فردوسی، رودکی اور مولانا روم نے مثنوی میں اس قدر شہرت حاصل کی کہ ان کے مثنویوں کے تراجم دنیا کی تمام نمایاں زبانوں میں موجود ہیں اور یہ شاعر صرف فارسی ادب تک محدود نہ رہے بلکہ بین الاقوامی ادب میں نمایاں ترین حیثیت رکھتے ہیں۔

قصہ گوئی اور اپنے دل کا حال بیان کرنا منثوی کا خاصا رہا ہے۔ اس میں شاعر کلی طور پر اپنے خیالات کے اظہار سے آزاد رہتا ہے۔ اس لیے آپ بیتی کے اثرات سب سے زیادہ اس صنف سخن پر موجود ہیں۔ مثنوی پر آپ بیتی کے اثرات کے بارے میں یہ بیان کیا گیا ہے۔ یوسف جمال انصاری کے بقول:

"یہ بھی ایک قدیم دستور چلا آتا ہے کہ اصل قصہ بیان کرنے سے پہلے شاعر خود اپنے دور اور اپنے حالات کو مختصر بیان کرے۔ اس حصے کو آپ بیتی کہا جائے تو نامناسب نہ ہو گا۔ دونوں صورتوں میں مثنوی نظم کے پیرائے میں سوانحی ادب کی اہم ضروریات کو پورا کرتی چلی آئی ہے۔"(۱۹)

مثنوی میں شاعر اپنی تعلیم خاندان اور پیشے کے بارے میں اجمالی طور پر ذکر کرتے تھے۔ لٰہذا عمومی طور پر مثنوی کا یہ حصہ شاعر کے اپنے تعارف اور حالات زندگی پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس طور مثنوی پر سوانحی اثرات بالخصوص آپ بیتی کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔

## رپورتاژ میں آپ بیتی کی جھلک:

رپورتاژ فرانسیسی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی اطلاع یا خبر دینے کے ہیں۔ واقعات اور حالات کو یکجا کرنے کا فن رپورتاژ کہلاتا ہے۔ یعنی جو واقعہ جس انداز میں وقوع پذیر ہوا۔ فنی باریکیوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بالکل اسی طرح بیان کرنا رپورتاژ کہلاتا ہے۔ مغربی ادب میں رپورتاژ کسی الگ صنف ادب کی حیثیت نہیں رکھتی۔ بلکہ اُسے صحافت، تاریخ اور سوانح کا بنیادی جز سمجھا جاتا ہے۔ بے باکی کے ساتھ سچائی کا بیان رپورتاژ کی بڑی خوبیوں میں سے ہے۔ اس صنف ادب میں رنگ آمیزی اور بناؤ سنگھار کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ گو یہ ایک عمدہ اور کار آمد صنف ہے مگر اُسے محض صحافت کے ساتھ مخصوص کر کے اُس کی اہمیت اور افادیت ختم کر دی گئی ہے۔

رپورتاژ اور آپ بیتی ایک دوسرے سے مماثل بھی ہیں اور کسی حد تک مختلف بھی ہیں۔ رپورتاژ بیانیے کے لحاظ سے سفرنامے سے زیادہ مماثلت رکھتا ہے۔ آپ بیتی میں مصنف کسی جگہ منظر، کیفیت میں اپنی ذات کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اس کے برعکس رپورتاژ میں اپنی ذات سے زیادہ دوسروں کے تاثرات اور جذبات زیادہ پیش نظر رکھتا ہے۔ ایک اور فرق جو آپ بیتی رپورتاژ کے درمیان فرق کو واضح کرتا ہے وہ یہ کہ رپورتاژ میں ایک مخصوص واقعے یا حادثے کا ذکر کرتے ہوئے لوگوں کے تاثرات اور رائے کو جگہ دی

جاتی ہے۔ جبکہ آپ بیتی عموماً زندگی کے آخری حصے میں یا ملازمت کے اختتام پر لکھی جاتی ہے۔ جس میں اپنے پیشہ وارانہ معمولات کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔

رپورتاژ کے آغاز کے بارے میں محققین مختلف رائے رکھتے ہیں۔ عمومی طور پر یہ کرشن چندر کی تصنیف پودے کو اردو کی پہلی باقاعدہ رپورتاژ کا درجہ دیا جاتا ہے۔ یہ رپورتاژ ۱۹۴۵ء میں حیدر آباد میں منعقدہ کانفرنس کے حوالے س ے تحریر کی گئی ہے۔ڈاکٹر انور سدید بھی پودے کو پہلی اردو رپورتاژ کا درجہ دیتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر رفیق حسین، سید معین الرحمن اور ڈاکٹر ثریا حسین مذکورہ رائے سے اختلاف کرتے ہوئے سجاد حیدر یلدرم کی سفر بغداد کو اردو کی پہلی رپورتاژ تسلیم کرتے ہیں جو ۱۹۰۴ میں لکھی گئی۔ طلعت گل نے رپورتاژ کی اولیت کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے پہلی دونوں روایات سے اختلاف کیا ہے اور سجاد ظہیر کی ''یادیں'' کو پہلی باقاعدہ رپورتاژ قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان مذکورہ رائے کی تائید میں لکھتے ہیں:

''پودے یادیں، قید یاغستان اور ان داتا وغیرہ سے بہت قبل ۱۸۸۴ء مولوی اقبال علی نے سر سید احمد خان کے سیکرٹری کی حیثیت سے اُن کے اپنے پنجاب کے علمی و سیاسی دور کو آنکھوں دیکھا حال کی صورت میں قلمبند کیا ہے۔ یہ روداد سفر نامے سے زیادہ رپورتاژ کی مکمل خصوصیات رکھتی ہے ---- جلسہ گاہوں کے ہجوم، تاثرات، انتظامات، جوش وخروش سر سید کی مختلف وفود ملاقاتوں چندے کی رقوم کی وصولی، اہل پنجاب کے جوش وخروش سر سید سے اُن کی عقیدت اور جذبات کے اظہار اور دوسرے امور پر روشنی ڈالی گئی کہ یہ پورا علمی و تعلیمی سفر اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ یہی رپورتاژ کی شناخت اور خوبی ہے۔''(۲۰)

اُردو ادب کے نثری حصے میں رپور تاژ کے خدوخال سفر ناموں اور مشاہیر ادب کے خطوط میں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ یہ ادبی صنف مغربی ادب سے لی گئی ہے مگر ہر افسانے اور مضمون کے برعکس رپور تاژ کے خدوخال تعریف ہنوز واضح نہیں ہیں۔ اس کی صورت بظاہر آپ بیتی سے مشابہہ ہے۔ لیکن داخلی سطح پر اس کی مثال آپ بیتی سے نہیں دی جا سکتی۔ ادب میں جب کوئی صنف اصلی تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہو تو رفتہ رفتہ منظر عام سے غائب ہونا شروع ہو جاتی ہے اور پھر نئی اصناف کی تلاش کی ضرورت پیش آتی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے بقول:

> ”آپ بیتی قلم بند کرنے والا تاریخ میں زیست کرتا ہے۔ لہٰذا تاریخ اور اس کے ساتھ ساتھ عصر و معاصرین کے بارے میں پسند ناپسند، تعصبات، نفرت وغیرہ پر مبنی اس کے رویے آپ بیتی میں بالواسطہ یابلاواسطہ یا طور پر اظہار پاسکتے ہیں لیکن اس کا بیان یا ان کا تبصرہ ذاتی ہو گا۔ لہٰذا اس سے غیر جانبداری کی توقع نہ ہونی چاہیے۔(ویسے تو مورخ کی غیر جانبداری بھی مفروضہ ہی ہے) اسے یوں سمجھے کہ حکومت اور حکمران مشترک ہوتا ہے۔ مگر ان سے وابستہ پسند وناپسند ذاتی ہے۔ اتنی ذاتی کہ اس کا تاریخ کے اصولوں پر مبنی ہونا ضروری نہیں۔ اس لیے آپ بیتی قلمبند کرنے والا حالات وواقعات یا حوادث وسانحات کا تذکرہ ذات سے ماورا ہو کر قلمبند نہیں کر سکتا۔ آپ بیتی کا یہ پہلو اُسے رپور تاژ کے قریب لے آتا ہے۔“(۲۱)

راست گوئی اور تاریخی صداقت جیسی یکساں خصوصیات کی بنا پر آپ بیتی اور رپور تاژ کو ایک دوسرے سے مماثل کرتی ہیں۔

## سفر نامہ میں آپ بیتی کی جھلک:

سفر نامے میں مصنف کسی سفر سے متعلق اپنے تجربات احساسات اور اپنی معاشرت کی دوسرے معاشروں سے موازانہ کرتے ہوئے تقابلی جائزہ پیش کرتا ہے۔ محققین نے مشہور یونانی مورخ ہیر وڈوٹس (۲۵ ۷ ق م) کو اولین سفر نامہ نویس قرار دیاہے۔ ادب میں انسانی معاشرت کے بیان کو اولین حیثیت دی جاتی ہے اور اجنبی زمینوں کی سیر اور حالات وواقعات کا دیگر سامعین کے سامنے بیان دوسروں کو ناصرف مہمیز کرنے میں مدد دیتے ہیں بلکہ زمانہ قدیم میں ایسا کرنا ایک خاص فن شمار ہوتا ہے۔ تجارتی قافلوں میں سفر کے دوران مختلف پڑاؤں پر ٹھہرنا اور شہروں میں جانا ایک رومانوی عمل گردانا جاتا ہے۔ عرب میں طویل صحرائی اسفار کے دوران عشق ومحبت کے قصے سامعین کے لیے ٹانک ثابت ہوتے تھے۔

علامہ اقبال کی نظم (ذوق وشوق) اسی طرح کی کیفیات سے مزین ہے۔ ہندوستان میں ریل نیٹ ورک کے قیام کے بعد اسی طرح کے تجربات پر مبنی واقعات حالات اور خطوط پر مبنی نئی تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ سفر نامہ بڑی حد تک آپ بیتی سے مشابہہ ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ سفر نامے میں سفر نامہ نویس صرف سفر سے متعلق واقعات کی تشریح وتفسیر تک محدود رہتا ہے۔ مگر آپ بیتی زندگی کے کسی حصے کے متعلق لکھی جاتی ہے۔ دانا اور فلسفی لوگ زندگی کو بھی ایک سفر سے تعبیر کرتے ہیں۔

سفر ناموں کا جائزہ لینے سے معلوم پڑتا ہے کہ تاریخ اور سفر نامے ایک دوسرے سے گہرا ربط رکھتے ہیں۔

ابن بطوطہ، مارکولو۔ اس جیسے کئی سیاحوں کی تصانیف تاریخی کتب کے حوالے بن چکے ہیں۔ علاوہ ازیں سعدی کی حکایات اور دیگر کتب میں ان کے مختلف اسفار سے متعلقہ واقعات جاگزین ہیں۔ سفر نامہ اور آپ بیتی دونوں میں مصنف کو مرکزی مقام حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے سفر نامے اور آپ بیتی دونوں کی مدد سے مصنف کے زبان وبیان، پسند وناپسند اور علم وہنر سے متعلق تفصیلی آگاہی حاصل ہوسکتی ہے جبکہ سوانح حیات یوں کسی دوسرے کے ہاتھ سے لکھی ہوئی ہوتی ہے جو ذاتی تجربات اور مشاہدات کے اظہار سے محروم رہتی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے بقول:

''سفر نامہ اگرچہ اجنبی زمینوں میں پیش آنے والے تجربات ومشاہدات کی روداد سہی لیکن اس سے لکھنے والے کی شخصیت کو کسی طرح بھی منفی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بدیشی زمین میں مشاہدات ''میں'' کی عینک سے ہوتے ہیں۔ مزید بر آں شعور یا غیر شعوری طور پر سفر نامے میں اپنے بارے میں یا اہل خانہ اور احباب کا ذکر بھی آتا ہے۔ یوں بعض اوقات حالات زیست کی فراہمی میں سفر نامہ (خام) ناقص مجمل یا مسخ ہونے کے باوجود بھی کچھ مواد فراہم کر سکتا ہے۔ جبکہ سفر نامہ نگاری کی خصوصی پسند و ناپسند ترجیحات اور نفرت و تعصبات سے اُس کی شخصیت کے منفی پہلو بھی آشکار ہو سکتے ہیں۔''(۲۲)

سفر نامے کی کئی اقسام ہیں ۔ حج بیت اللہ اور زیارتوں کے علاوہ مغربی، مشرقی ممالک کے سفر نامے ہند وپاک میں دستیاب ہیں ۔ زبان وبیان کی خوبیاں سفر نامے کی لذت کو کم یا زیادہ کرتی ہیں ۔ سفر نامہ خواہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی دونوں صورتوں میں اظہار ذات سے متعلق ہے۔ لہٰذا یہ خصوصیت اسے آپ بیتی سے قریب کرتی ہے۔

## انٹرویو میں آپ بیتی کی جھلک:

انٹرویوز بھی مشاہیر ادب کے حالات وواقعات قارئین تک پہنچانے کا اہم وسیلہ ہوتے ہیں ۔ لہٰذا اہم شخصیات کے انٹرویوز کے ذریعے ان افکار رسائل واخبارات اور ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے ذریعے سامعین قارئین تک پہنچاتے ہیں۔ انٹرویوز چونکہ مخصوص سوالات ادیب کی ذاتی ادبی زندگی سے متعلق کیے جاتے ہیں ۔ لہٰذا ان سوالات کے جوابات کی کھوج میں ادیب کی اصل شخصیت اور فن کے سرچشمے تک رسائی آسان ہو جاتی ہے۔ جب کوئی بڑا تخلیق کار، ادیب اپنی تخلیقات کے ذریعے اپنی حیات کے گوشوں تک رسائی میں ناکام ہو جائے تو انٹرویوز ہی وہ واحد راستہ ہوتے ہیں جن کے ذریعے نا صرف فن وادب سے متعلق اُس

کے افکار تک رسائی ہوتی ہے۔ بلکہ اُس بھڑکتے اور چیختے چلاتے سوالات سے متعلق بھی رہنمائی ہوتی ہے۔ یوں اُس کا تخلیق کردہ ادب پڑھنے کے باوجود تشنہ رہ جاتے ہیں۔ مشاہیر ادب سے لیے گئے انٹرویوز کو ایک ہی جگہ یکجا کر کے کتابی صورت دینے کی وجہ سے ادیب کی ذاتی اور فنی زندگی سے متعلق معلومات تک رسائی حاصل کرنے میں نا صرف آسانی پیدا ہوتی ہے بلکہ اس صورت میں انٹرویوز میں موجود تضادات اور اشتراکات کو بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔

آپ بیتی اور انٹرویوز دونوں ایک دوسرے سے گہری مماثلت رکھتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انٹرویوز میں پوری تیاری کے ساتھ سوالات تیار کر کے پوچھے جاتے ہیں جبکہ آپ بیتی میں اپنی مرضی کے مطابق اپنے افکار اور معمولات کا بیان کیا جاتا ہے۔ انٹرویوز شخصیت جاننے کا ایسا وسیلہ ہے جس میں سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں اقسام کے سوالات کیے جاتے ہیں اور اسی مناسبت سے جوابات کی توقع کی جاتی ہے۔ جبکہ انٹرویو دینے والا شخص اپنی مرضی سے نہیں بلکہ جیسا سوال کیا جاتا ہے اس کے مطابق جواب دیتا ہے۔ مگر آپ بیتی ذہن میں ابھرنے والے سوالات اور اس کے جوابات اس کی اپنی ذات تک محدود رہتے ہیں۔ اگر وہ کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتے تو اُن کے اوپر کسی قسم کا دباؤ موجود نہیں ہوتا۔ مگر انٹرویوز میں ممکنہ حد تک ناپسندیدہ سوالات کے جوابات دینے سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مگر مکمل طور پر لاتعلق نہیں رہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود انٹرویوز اور آپ بیتی میں گہری مماثلت کی بنیادی وجہ دونوں میں حالات وواقعات کا ذکر ہوتا ہے۔ زندگی کے تجربات اور مشاہدات کا نچوڑ ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ دونوں الگ صنف سخن ہیں۔ لیکن خصوصیات کی بنیاد پر یہ دونوں ایک دوسرے سے قریب تر ہو جاتی ہیں۔

## آپ بیتی کی اہمیت وافادیت:

سوانح حیات ہو، آپ بیتی ہو یا افسانہ اور ناول سب میں ہی انسانی شخصیت کے کچھ نہ کچھ پہلو سامنے آتے ہیں۔ اوّل الذکر بیان کردہ دو اقسام میں انسانی شخصیت کے نمایاں پہلو زیادہ نکھر کر سامنے آتے ہیں۔

سوانح حیات پر آپ بیتی کی اہمیت اس لیے زیادہ ہوتی ہے کہ اس میں ایک مصنف اپنے بارے میں خود بیان کرتا ہے۔ اس لیے وہ تجربات اور احساسات اپنے بیان میں لے آتا ہے۔ جو کوئی دوسرا شخص اس کی سوانح لکھنے کے باوجود اس کی سوچ اور افکار کو واضح طور پر بیان نہیں کر سکتا۔

یہ بات ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیا میں پیدا ہونے والے تمام انسان شکل وصورت اور فکر میں یکسانیت رکھنے کے باوجود کہیں نہ کہیں اختلاف رکھتے ہیں چونکہ یہ اختلاف ان کی پرورش، حالات، زندگی، مشاہدات اور تجربات کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اس لیے انسانی نقطہ نظر کسی مدعے پر الگ ہوتا ہے اور کہیں دوسرے انسانوں سے مشابہہ۔ یہی مشابہت اور اختلاف دنیا میں رنگارنگی پیدا کرنے کا سبب ٹھہرتا ہے۔

آپ بیتی میں اختلاف اور تسلیم کا پہلو ہر وقت سامنے آتا ہے۔ ایک سوانح نگار اگر کسی شخص کے ساتھ زندگی کا بیشتر حصہ گزار دے تب بھی شخصیات کے بعض پہلو اس کی نگاہ سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ کیونکہ انسان معاشرے میں جو رویہ اور سلوک اپناتا ہے۔ وہ اُس کی ذات کا بہت کم حصہ دکھلاتا ہے۔ اپنی ذات کے دکھلانے کے زیادہ معاملات وہ دنیا کے تمام لوگوں کی نظر سے پوشیدہ ہی رکھتا ہے۔

آپ بیتی میں تاریخ، آپ بیتی نگار کے ذاتی حالات، معاشرتی، ثقافتی، سیاسی، معاشی اور مذہبی تمام معاملات کا ذکر ملتا ہے۔ بالخصوص اُس عہد کا ذکر ہوتا ہے جس عہد سے آپ بیتی نگار کا تعلق ہوتا ہے۔ اس کی مدد سے جہاں تاریخی حوالوں سے کسی ادیب کے نقطہ نظر کو جاننے میں مدد ملتی ہے تو دوسری جانب اس کی اجتماعی نفسیات کی ایسی تصویر سامنے آتی ہے جس کا کھینچنا ایک سوانح نگار کے لیے ناممکن بات ہے۔ آپ بیتی آپ بیتی نگار کی سوچ اور نفسیات کو زیادہ بہتر انداز میں واضح کرتی ہے۔ بعض اوقات نہ چاہتے ہوئے بھی آپ بیتی نگار اپنی شخصیت کے ایسے پہلو سامنے لے کر آتا ہے۔ جو وہ بیان نہیں کرنا چاہتا۔ مگر نادانستہ طور پر اُس کی زبان سے ادا ہو جاتے ہیں۔ آپ بیتی میں بچپن سے لے کر عمر کے بڑے حصے تک کے واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔ اس لیے اس میں تاریخی نوعیت کے حوادث کی تشریح اور مصنف کا زاویہ نگاہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

اخبارات میں کسی سیاست دان یا کھلاڑی کی زندگی کے کسی واقعے کو اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق دیا جاتا ہے مگر جب وہ آپ بیتی تحریر کرتا ہے تو مذکورہ واقع کے پس پردہ عوامل سے بھی پردہ اٹھاتا ہے۔ یوں ہمیں واقع کو صحیح تناظر میں سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ زندگی کے اندر رونما ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان ارتقائی مراحل سے گزر رہا ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ کامیابیوں کا جو سفر طے کرتا ہے اُس کا بھی ذکر ہوتا ہے۔

علم الدین سالک کے بقول:

> ''ہر دور اپنی مخصوص تہذیب رکھتا ہے۔ اس کے بنیادی خدوخال تو صدیوں کے بعد تبدیل ہوتے ہیں مگر فروعی چیزیں ہر دور اور زمانے میں بدلتی رہتی ہیں۔ ان کی نشاندہی عام تاریخی کتابیں نہیں کر سکتیں۔ ہمیں ان کے لیے آپ بیتیوں کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔ کیونکہ ان کی مدد سے ہم ایک قوم ایک ملت اور ایک ملک کی تہذیب کی ابتدا اور عہد بہ عہد ترقیوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔''[۲۳]

دنیا میں ہر خطے کے اپنے رسوم ورواج ہوتے ہیں اور مذہب سے وابستہ کچھ ایسے تقاضے ہوتے ہیں جن کا پورا کرنا بہرکیف ضروری ہوتا ہے۔ جب ہم کسی اور زبان سے وابستہ کسی شخصیت کی آپ بیتی پڑھتے ہیں تو ہمیں نا صرف وہاں ثقافتی رسوم سے آگاہی حاصل ہوتی ہے بلکہ بعض ایسی وجوہات بھی سامنے آتی ہیں جب ہمیں اپنے اور آپ بیتی نگار کے معاشرتی فرق کا تقابل کرنا پڑتا ہے اور یوں ہمیں دوسروں کے نقطہ نظر کے ساتھ ساتھ ان کی سماجی افکار اور معاشرتی مجبوریوں کا کھل کر احساس ہوتا ہے۔ یوں تو ذرائع ابلاغ و آمد و رفت کے اس دور میں ثقافتیں باہم مل کر ایک نئی عالمی ثقافت کی بنیاد ڈال چکی ہیں اور وہ وقت دور نہیں جب انسان زبان کے فرق کے علاوہ یکساں ثقافتی اقدار کا حامل ہو گا۔ مگر دنیا میں آب وہوا کا فرق جس طرح نباتات وجمادات پر ہوتا ہے وہی فرق لے کر آتا ہے۔ انسان کے سوچنے پر اس طرح یکسانیت کے باوجود فکر کے زاویوں میں فرق کو تلاش کرنا ایک قاری کے لیے نہایت آسان بات ہے۔ آپ بیتی چونکہ تجربات اور احساسات کا مجموعہ ہوتی ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ ترقی پا کر مکمل طور پر سامنے آتی ہے۔ اس لیے اس کا مطالعہ انسانی مشاہدات کو مزید وسعت دینے میں ممد و معاون ہے۔

## ج: پاکستان میں سیاسی آپ بیتیوں کا پس منظری مطالعہ:

پاکستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ایک آزاد، خود مختار اور اسلامی فلاحی ریاست کے طور پر معرض وجود میں آیا۔ مملکت خداداد پاکستان حقیقت میں مسلمانان برصغیر کی تحریک آزادی کا وہ ثمر ہے جو انہیں انگریز کے خلاف بر سر پیکار رہنے پر نصیب ہوا۔ انگریز اگرچہ تجارت کے حصول کے لیے ہندوستان آیا تھا لیکن مغلیہ بادشاہوں کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے ہندوستان کے سیاہ سفید کا مالک بن گیا جس کے بعد انھوں نے مسلمانوں کی مذہبی آزادی کو سلب کر لیا۔ جس کا برصغیر کے مسلمانوں کو شدت سے احساس ہوا تو مختلف اکابرین نے مختلف انداز میں آزادی کی تحریکیں چلائیں۔ جس کی بدولت آخر کار قائد اعظم جیسے عظیم مدبر اور صاحب بصیرت، سیاست دان کی سربراہی میں آزادی کی تمام تحریکوں کو پاکستان کی شکل میں ایک کامیابی ملی۔ پاکستان کے پس منظر پر اگر نظر دوڑائی جائے تو بہت سے حریت رہنماؤں کی کوششیں اس میں شامل ہیں۔

پاکستان جغرافیائی اور سیاسی لحاظ سے نہایت اہم خطہ رہا ہے۔ پاکستان جس جغرافیائی خطے کا حامل ہے اُس کی بدولت ہمیشہ سے سیاسی اور سماجی تغیر و تبدل کا مرکز رہا ہے۔ پاکستان اگرچہ ۱۹۴۷ء میں قائم ہوا تو کوئی مضبوط آئین نہیں تھا جس کی وجہ سے ۱۹۳۵ء کے انڈین ایکٹ میں متعدد ترامیم کر کے پاکستان جیسے نئے قائم ہونے والے ملک کا نظام حکومت چلایا گیا۔ پاکستان پہلا آئین ۱۹۵۶ء کو وجود میں آیا جب ہمارے وطن عزیز کو قائم ہوئے ۹ برس بیت چکے تھے۔ لیکن ملک میں سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے دو سال بعد ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء کے لگ جانے پر اسمبلیاں تحلیل کر دی گئیں اور ۱۹۶۵ء کے آئین کو منسوخ کر دیا گیا اور اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں ایک نیا صدارتی طرز کا آئین وطن عزیز کو دیا گیا۔ سقوط ڈھاکہ اور اس کے بعد بھی ۱۹۷۳ء میں ایک متفقہ آئین پاکستان کو دیا گیا۔ جس کی تمام سیاسی، سماجی حلقوں نے حمایت کی جو آج بھی بہت سی ترامیم کے ساتھ ہنوز قائم و دائم ہے۔

پاکستان میں سیاسی عدم استحکام، اقتدار کی رسہ کشی طاقت کے بل بوتے پر اقتدار کا حصول اور تین مارشل لاؤں کا نفاذ جمہوری حکومتوں کے تختہ الٹنے کی وجہ سے جمہوریت کی جڑیں ملک میں مضبوط نہیں ہو سکی ہیں۔ ”امور ریاست حکمرانی، اور عوامی مسائل کے حل کے لیے جدوجہد کرنے والی شخصیات کو سیاست دان کہا جاتا ہے۔“

قیام پاکستان سے لے کر اب تک پاکستان کے اندر مختلف گروہوں، مختلف شخصیات اور مختلف پارٹیوں کو ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کا موقع ملا ہے۔ ان میں سے چند ایک نمایاں شخصیات نے اپنے حالات وواقعات، سیاسی جدوجہد کو قلمبند کر کے کتابیں مرتب کی ہیں۔ ذاتی حوالے سے تحریر کی گئیں ان کتابوں کو آپ بیتی کہا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض نے اردو اور بعض نے انگریزی میں اپنے حالات وواقعات بیان کیا ہے جن میں سے بعض انگریزی کتابوں کے تراجم بھی ہو چکے ہیں۔

اُن کو اردو میں آپ بیتی اور انگریزی میں آٹو بائیو گرافی (Autobiography) کہا جاتا ہے۔ سیاسی آپ بیتیاں پاکستان کے سیاسی منظر نامے میں ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

1۔ ایوب خان: ”Friends not master“

مترجم غلام عباس: جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی۔

۲۔ ذوالفقار علی بھٹو: ”If I am Assassinated“

مترجم: مجاھد لاہوری ”اگر مجھے قتل کیا گیا۔"

۳۔ شیخ رشید احمد: فرزند پاکستان

۴۔ بے نظیر بھٹو: "Daughter of the East"

مترجم: سجاد بخاری "دختر مشرق"

۵۔ یوسف رضا گیلانی: "چاہ یوسف سے صدا"

۶۔ جنرل پرویز مشرف: "In the line of fire"

مترجم: ہدایت خویشگی "سب سے پہلے پاکستان"

۷۔ جاوید ہاشمی: "ہاں میں باغی ہوں"

"تختہ دار کے سائے تلے"

۸۔ عبد المجید ملک: "ہم بھی وہاں موجود تھے"

یہ وہ چند سیاست دان ہیں جنھوں نے اپنے سیاسی حالات وواقعات پاکستان کے اندرونی وبیرونی حالات وواقعات میں سے جن چیزوں کو قریب سے دیکھا انھوں نے اس کو صفحہ قرطاس پر لا کر عوام الناس تک پہنچایا ہے۔

## ایوب خان:

فیڈ مارشل لاء صدر ایوب خان کی آپ بیتی ۱۹۶۵ء میں چھپی۔ جو انگریزی زبان میں تھی۔ جس کا عنوان یہ تھا "Friends not masters" پھر اِس کا اردو ترجمہ "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" کے نام سے غلام عباس نے کیا۔

ایوب خان پیشہ کے لحاظ سے ایک فوجی تھے لیکن وہ پہلے جنرل تھے جنہیں بطور وزیر دفاع مقرر کیا گیا۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ملکی سیاسی صورت حال پر گہری نظر رکھتے تھے۔ لیاقت علی خان کے قتل

کے بعد ملک سیاسی عدم استحکام کا شکار ہو گیا۔ آخر کار مارشل لاء ہی ملک کا مقدر بنا۔ ان سب چیزوں کا تذکرہ ایوب خان نے بڑی بے باکی سے کیا ہے۔ اگرچہ ملک میں مارشل لاء کی بنیاد رکھنے والے خود ہیں۔ ایوب خان نے مصلحت پسندی سے کام لیتے ہوئے واقعات کو انتہائی صاف شفاف اور ایمانداری سے تحریر کیا ہے۔ اگرچہ ایوب خان کی آپ بیتی میں ۱۹۶۵ء کے صدارتی انتخاب سے پہلے کے حالات وواقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ۱۹۶۵ء کے صدارتی انتخاب جو انھوں نے فاطمہ جناح کے مقابلے میں لڑا اُس کا تذکرہ نہیں ہے۔ ایوب خان کے صدر منتخب ہونے کے بعد کے حالات وواقعات اس میں شامل نہیں ہیں تو اس وجہ سے اس کو مکمل آپ بیتی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اس میں انھوں نے گورنر غلام محمد اور صدر سکندر مرزا کی اندرونی چپقلش آپس کی کھینچا تانی اور سیاسی کرشمہ سازیوں کا ذکر کر کے انھوں نے جذبہ حب الوطنی سے سرشار ایک فوجی رہنما ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ واقعات کو حقیقی طور پر بیان کرنے کی وجہ سے آپ بیتی کو معتبر حیثیت عطا کرتا ہے۔

## ذوالفقار علی بھٹو:

پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی ذوالفقار علی بھٹو نے " If I am Assassianted" کے عنوان سے ۱۹۷۸ء میں آپ بیتی لکھی اور اس کا اُردو ترجمہ مجاہد لاہوری نے کیا۔ "اگر مجھے قتل کیا گیا" ذوالفقار علی بھٹو ایوب دور میں پاکستان کے وزیر خارجہ اور پھر اُس کے بعد ۱۹۷۰ء میں وزیر اعظم بنے۔ یہ کتاب ذوالفقار علی بھٹو کی زندگی کا خلاصہ ہے۔ یہ کتاب انھوں نے اس وقت لکھی جب وہ ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی میں قصوری قتل کیس کے مقدمے میں پابند سلاسل تھے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے ایام اسیری جھوٹے مقدمے میں گرفتاری ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں دھاندلی کے خلاف چلنے والی تحریک اور جیل کی سختیوں کے ساتھ ساتھ داخلی خارجی پالیسی، سیاست میں فوج کی مداخلت اور ملک میں سیاسی عدم استحکام سمیت تمام چیزوں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اس یادگار تاریخی دستاویز میں بھٹو کی فہم وفہراست ان کا انداز فکر و تدبر سب واضح ہو

جاتا ہے۔ یہ کتاب سچے واقعات و حقائق اور کرداروں کے دلچسپ اور چونکا دینے والے انکشافات پر مبنی ہے۔ المختصر اس کتاب کو پڑھ کر یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ ایک زیرک سیاست دان اور حالات وواقعات سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔

## شیخ رشید احمد:

"فرزند پاکستان" شیخ رشید احمد مشہور سیاست دان کی آپ بیتی ہے۔ آپ بیتی ٦ ابواب اور ٢٠٨ صفحات اور اس کے ساتھ ساتھ شیخ رشید کی زندگی کی چند یادگار تصویریں شامل ہیں۔ اس آپ بیتی میں ان کے بچپن سے ١٩٩٤ء میں ان کے جیل جانے تک کے واقعات کا اندراج ہے۔ شیخ رشید احمد ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی جنھوں نے سیاست کے میدان میں بہت زیادہ کامیابیاں سمیٹی ہیں اور راولپنڈی سے کئی مرتبہ رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئے۔

ان کی آپ بیتی میں سچائی اور قومی اُمنگوں کی ترجمانی نظر آتی ہے۔ وہ سکول میں ہی سیاسی میدان کے کھلاڑی بنے اور بعد میں اس میدان کے شہسوار کہلائے۔ اپنی افتاد طبع کے باعث وہ کئی مرتبہ جیل بھی گئے۔ ان میں یہ وقت جوابی حملے، پنڈی کی مخصوص روایتی، جملہ بازی بذریعہ اتم موجود ہے۔ اپنی جماعت عوامی مسلم لیگ کے قیام کے بعد انھوں نے کئی مرتبہ حکمران جماعت کے خلاف جارحانہ اور حق پر مبنی رویہ اختیار کیا ہے۔ یہ آپ بیتی "فرزند پاکستان" شیخ رشید کے بچپن جوانی اور ادھیڑ عمری کے زمانے تک کے چیدہ چیدہ واقعات کے اندراج پر مشتمل ہے۔ اس میں شیخ رشید احمد کی یہ تصنیف ان کے سیاسی اور معاشرتی تجربے کی یہ ایک خوبصورت مثال ہے۔ جس میں سادگی اور بے ساختگی نمایاں نظر آتی ہے۔ شیخ رشید احمد نے بہت سادہ انداز میں تاریخ پاکستان کے اہم واقعات کو اپنے نقطہ نظر کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یوں یہ کتاب نا صرف ان کی ذاتی زندگی کا حوالہ بن گئی ہے بلکہ تاریخی واقعات کے تناظر میں ان کی بھی تفصیلی وضاحت کرتی ہے۔

## بے نظیر بھٹو:

۱۹۹۵ء میں پاکستان کی سابقہ وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کی آٹو بائیو گرافی، انگریزی میں "Daughter of the East" کے عنوان سے چھپی۔ جس کا اُردو ترجمہ "سجاد بخاری" نے "دختر مشرق" کے عنوان سے کیا ہے۔ یہ مسلم ممالک کی پہلی حکمران خاتون ہے اور اس کو پاکستان میں دو مرتبہ وزیر اعظم بننے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس کتاب میں بے نظیر بھٹو نے اپنی اور اپنے خاندان کی سیاسی جدوجہد کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب ۶۲۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کو ۱۶ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں بے نظیر بھٹو نے اس میں سوانحی حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے گھر یعنی بھٹو خاندان کے مخصوص سیاسی پس منظر کا تذکرہ کیا ہے اور ان چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ جس سے محترمہ بے نظیر بھٹو کی شخصیت نکھر کر سامنے آتی ہے۔ اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو اور اپنے بھائیوں شاہنواز اور مرتضیٰ بھٹو کی سیاسی کاوشوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور فوجی حکومت کے ان کے خاندان پر ظلم و ستم اور ذوالفقار علی بھٹو پر قتل جیسے جھوٹے مقدمے پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس دوران بے نظیر بھٹو نے بھی ایک فعال سیاسی کردار ادا کیا اور مختلف لوگوں سے اندرون ملک اور بیرون ملک رابطے کیے اور زبردست تحریک چلائی والد کو بچانے کے لیے۔ اس آپ بیتی میں بے نظیر بھٹو ایک کہنہ مشق سیاست دان کے ساتھ ساتھ ایک بیٹی اور بہن کے روپ میں نمایاں ہوتی ہیں۔

## یوسف رضا گیلانی:

۲۰۰۶ء میں سابق وزیر اعظم پاکستان یوسف رضا گیلانی کی آپ بیتی "چاہ یوسف سے صدا" چھپی اور اس کو سیاسی اور عوامی حلقوں میں بہت زیادہ پذیرائی ملی۔ جس کی بدولت ایک ماہ بعد ہی دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا۔ یوسف رضا گیلانی کا تعلق پاکستان پیپلز پارٹی سے ہے۔ گیلانی صاحب ایک با اصول اور منجھے ہوئے سیاست دان ہیں۔ ان کو پارٹی وفاداری کے باعث بے نظیر بھٹو کے دوسرے دور حکومت میں (سپیکر قومی اسمبلی) کے عہدے پر فائز رہے اور اس کے بعد ۲۰۰۸ء میں جب وفاق میں پیپلز پارٹی کی حکومت بنی تو

وزارت اعظمیٰ کے منصب پر فائز ہوئے۔ اگرچہ ان کی یہ آپ بیتی ان کے وزیر اعظم بننے سے پہلے کے حالات وواقعات پر مشتمل ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک ادھوری آپ بیتی ہے۔ فوجی حکومت کے دور میں انہیں بھی ایام اسیری سے گزرنا پڑا۔ ان کو بھی جیل کی کال کوٹھڑی میں جانا پڑا اور یہ کتاب انھوں نے ایام اسیری میں لکھی۔ یہ آپ بیتی ۲۷۵ صفحات اور دس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے خاندانی پس منظر پر پر معز گفتگو کی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کے سیاسی حالات واقعات جو مختلف ادوار میں رونما ہوئے ان کا ذکر کیا ہے۔ ان کا تعلق پیپلز پارٹی سے ہے انھوں نے جنرل ضیاالحق، جونیجو، بے نظیر بھٹو، نواز شریف اور جنرل مشرف ان سب کے ادوار میں ایک فعال سیاسی کارکن کی حیثیت سے عملی سیاست میں حصہ لیا۔ اس آپ بیتی میں انھوں نے مختلف ادوار میں ہونے والے مختلف سیاسی حالات وواقعات پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

## جنرل پرویز مشرف:

۲۰۰۶ء میں سابق صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف کی آپ بیتی انگریزی میں In the Line of Fire کے عنوان سے انگلستان سے شائع ہوئی اور پاکستان میں اس کا اُردو ترجمہ ہدایت خویشگی نے کیا۔

۴۱۸ء صفحات پر مشتمل اس آپ بیتی کو ۶ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

جنرل پرویز مشرف کی آپ بیتی ”سب سے پہلے پاکستان“ اس میں زندگی کے ابتدائی حالات چار سال کی عمر میں ہجرت لڑکپن اور جوانی کے حالات وواقعات کے علاوہ پیشہ وارانہ فوجی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ مختلف حالات وواقعات کارگل آپریشن اور ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو جمہوری حکومت کی بساط لپیٹ کر مارشل لاء کا نفاذ کن وجوہات کی بنا پر کیا گیا۔ ان سب کی تفصیل ملتی ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے

کہ وطن عزیز اس دور میں کن مشکلات سے نبرد آزما تھا۔ اس آپ بیتی میں افغانستان پر امریکہ کے حملے، طالبان کی حکومت کے زوال دنیا بھر میں ہونے والی دہشتگرد کاروائیوں اور جنوبی ایشیا کے لیے امریکہ کی پالیسیوں پر اسیر حاصل گفتگو کی ہے۔ یہ آپ بیتی تاریخی بھی ہے اور معاشرتی بھی۔ اس میں سیاست کے رنگ بھی نمایاں نظر آتے ہیں اور صدر مشرف کی اقتصادی پالیسیوں کی جھلکیاں بھی دکھائی گئی ہیں۔

## جاوید ہاشمی:

۲۰۰۵ء میں ''جاوید ہاشمی'' کی آپ بیتی ''ہاں میں باغی ہوں'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ جاوید ہاشمی کا شمار پاکستان کے نمایاں ترین سیاست دانوں اور صف اول کے رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ اکتوبر ۱۹۹۹ء میں جب مارشل لا کا نفاذ کیا گیا تو پاکستان کے منتخب وزیر اعظم کو معزول کر کے پہلے جیل اور پھر اُس کے بعد ملک بدر کر دیا گیا تو انھوں نے پاکستان مسلم لیگ نواز گروپ کے قائم مقام صدر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ جاوید ہاشمی کو بھی مارشل لاء دور میں بالآخر ایک جھوٹے مقدمے میں پابند سلاسل کیا گیا اور ان پر بغاوت کا جرم عائد کیا گیا اور یہ آپ بیتی انھوں نے پابند سلاسل رہتے ہوئے لکھی۔ یہ کتاب ۴۴۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۱۳۱ ابواب شامل ہیں جن میں مصنف نے اپنے سوانحی حالات کے ساتھ ساتھ پاکستان کی سیاست کے مختلف ادوار کو اپنی سیاسی سوچ و بچار کے مطابق پیش کیا ہے۔ اس آپ بیتی میں انھوں نے جمہوری حکومتوں کی مدت پوری نہ کرنے اور بار بار لگنے والے مارشل لاء کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اپنے مقدمے کی تفصیلات نہایت صداقت اور سچائی کے ساتھ بیان کی ہیں اور اس میں اپنی بیٹی کے نام لکھے گئے خطوط بھی شامل ہیں۔

جاوید ہاشمی کی ایام اسیری میں لکھی گئی دوسری تصنیف ''تختہ دار کے سائے تلے'' ہے یہ ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی اور اس کو اُن کی آپ بیتی کا حصہ دوم قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان دونوں کتابوں میں جاوید ہاشمی نے جیل کے معمولات کے حوالے سے اپنے گہرے تاثرات اور مشاہدات قلمبند کیے ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعے سے قارئین جاوید ہاشمی کی سیاسی جدوجہد سے پوری طرح واقف ہو جاتے ہیں۔

## عبدالمجید ملک:

لیفٹننٹ جنرل (ر) عبدالمجید ملک نے اپنی داستان حیات ''ہم بھی وہاں موجود تھے'' کے عنوان سے تحریر کی ہے جو ۲۰۱۵ء میں چھپی۔ یہ کتاب ۱۳۱ابواب پر مشتمل ہے اور ۳۲۸صفحات اور اس کے علاوہ سکندر مرزا کے استعفی کی دستاویزات جو انگریزی میں ہے اور اس کے ساتھ وہ انگریزی خط جو انھوں نے ضیا الحق کو مراکش میں بطور سفیر خدمات سرانجام دیتے ہوئے لکھا۔ جس میں انھوں نے بھٹو کو پھانسی نہ دینے کا مشورہ دیا اور انھوں نے اپنی زندگی کی یادگار تصویریں بھی شامل کی ہیں۔

جنرل عبدالمجید ملک نے اپنی داستان حیات میں اپنی زندگی میں بطور فوجی آفیسر، سفیر اور سیاست دان تمام میں اپنی صلاحیتوں سے کامیابیاں حاصل کی ہیں جس کا ذکر انھوں نے اپنی داستان حیات میں کیا ہے۔ اس میں انھوں نے پاکستان کے ابتدائی حالات وواقعات فوجی اور جمہوری حکمرانوں کی آپس میں رسہ کشی، ۱۹۶۵ء کی جنگ سقوط ڈھاکہ ۱۹۷۱ء کی جنگ۔ ملک میں لگنے والے مارشل لاؤں، جمہوری حکومتوں کے خلاف سازشیں اور سیاست دانوں کا محکموں میں بے جا مداخلت اور ملٹری اور سیاست کے میدان میں اپنا کردار اور ملکی وسائل پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ جنرل مجید ملک نے اپنی آپ بیتی میں تقریباً ایک صدی کے حالات وواقعات کو رقم کیا ہے اور صدی بھی وہ جس میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس لحاظ سے اس آپ بیتی کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے کہ یہ کتاب پاکستان کے اندرونی اور بیرونی حالات وواقعات کی تاریخی دستاویزات ہے۔

## د) تقابلی مطالعہ کا مفہوم اور اس کے اصول وضوابط:

### تقابل کیا ہے؟ اور تقابلی مطالعہ کا مفہوم:

تقابل تَ قابل کے معنی ہیں۔ آمنے سامنے کھڑے ہونا کے ہیں۔

تقابل کے لغوی معنی آمنا سامنا کرانا یا ہونا کے ہیں۔ دو اشیا کا خصوصیات اور صلاحیتوں کے لحاظ سے موازنہ تقابل کہلاتا ہے۔ ادبی فن پاروں میں تقابل اس میں مماثلت یا اختلاف کے پہلوؤں کی وضاحت کرتا ہے۔

بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

"تقابل، موازنہ، مقابلہ، مماثلت، مشابہت، مثال، نظیر، دو چیزوں کے درمیان موازنہ خصوصاً یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ان میں کیا خصوصیات مماثل اور کیا غیر مماثل ہیں۔"(۲۴)

عربی زبان میں تقابل کے لیے آمنا سامنا ہونے کے معنی بیان ہوئے ہیں۔

"مقاہمہ، مقابلہ، تقابل، موازنہ اور آمنا سامنا جیسے کلمات ہماری روز مرہ کی گفتگو میں شامل ہوتے ہیں۔ کیونکہ غیر ارادی طور پر اور اراد تاً اس دنیا میں اپنے وجود کو ثابت کرنے کے لیے اور زیادہ دیر تک باقی رہنے کے لیے انسان ہمیشہ سے مختلف طریقے استعمال کرتا رہتا ہے۔ موجودہ دور میں سائنس کا استعمال زندگی کے ہر شعبے میں ایک معمول کی بات لگتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہ اصطلاح جتنی ادب میں مقبول ہے اس سے کہیں زیادہ عام انسانی زندگی میں استعمال ہو رہی ہے۔ انسان دوسرے جانداروں کے مقابلے میں اشرف المخلوقات اسی وجہ سے کہلاتا ہے کہ اس میں وہ شعوری صلاحیت موجود ہے جو اسے بقیہ حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ جب سے انسان اس زمین پر آیا ہے۔ انسان نے مشاہدے کے ذریعے فطرت کے غیر موافق حالات کو اپنے حالات میں کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ یقیناً مشاہدے کی یہ فطرت ادب میں اختلافات واشتراکات تلاش کرنے میں اس کی معاون ہے۔"

اصطلاح میں تقابل دو یا دو سے زیادہ اشیاء کے مابین خصوصیات اور علم و فن کی بنیاد پر اشتراک و اختلاف کو واضح کرنے کا نام ہے۔ تنقید و تحقیق ادب میں تقابل کا عمل ایک پل یا اوزان کا کردار ادا کرتا ہے جو نہ صرف ایک محقق و نقاد کو کامیاب بناتا ہے بلکہ اس کی رائے کو واضح بنانے میں بھی اس کی مدد کرتا ہے۔ ایک محقق کے لیے تنقید اتنی ہی ضروری ہے جتنا ایک نقاد کے لیے تحقیق اہمیت رکھتی ہے۔

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کے مطابق:

''موازنہ مشترک بنیاد رکھنے والی دو چیزوں کا تقابلی مطالعہ ہے۔ چنانچہ باغ وبہار کا فسانہ عجائب سے موازنہ کیا جاتا ہے کہ دونوں داستانیں ہیں۔ غالب کی غزل کا مومن کی غزل سے موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے موازنہ انیس ودبیر میں ان دو باکمال شعرا کا مرثیہ گو شاعروں کی حیثیت سے موازنہ کیا ہے۔ اصولاً موازنہ میں ترجیح کا سوال شامل نہیں۔ لیکن بالعموم موازنہ کرنے والے نقاد ایک فنکار یا فن پارے کی دوسرے فن کار یا فن پارے پر ترجیحی ثابت کرنے کی خواہش سے کلی طور پر اجتناب نہیں برت سکتے۔ بعض اوقات نقاد کا ایک مقصد یہی ہوتا ہے کہ ایک ادب پارے کی دوسرے ادب پارے پر یا ایک فنکار کی دوسرے فنکار پر ترجیح ثابت کی جائے۔''(۲۵)

مثال کے طور پر انیس اور دبیر کا موازنہ شبلی نے کیا اور انیس کو زیادہ اہمیت دی۔

موازنہ کرنے کے لیے کسی مشترک بنیاد کی ضرورت مسلم ہے۔ مولٹن کے دبستان تنقید میں موازنے کی گنجائش ہی نہیں۔ اس کا خیال یہی ہے کہ ایک شاعر کا دوسرے شاعر سے یا ایک ادب پارے کا دوسرے ادب پارے سے موازنہ کرنے کے لیے کوئی مشترک بنیاد سرے سے موجود ہی نہیں ہوتی۔ ہر ادب پارے کو پرکھنے کے اصول وضوابط اس ادب پارے کے اندر سے اخذ کیے جاتے ہیں۔

موازنہ یا تقابل کا چونکہ تحقیق وتنقید سے براہ راست تعلق ہوتا ہے یا بالفاظ دیگر تقابل و تحقیق وتنقید کا یہی ایک حصہ ہے۔ اس لیے جب کوئی محقق یا نقاد دو فن پاروں کے مابین تقابل کی ذمہ داری لیتا ہے تو دو فن پاروں کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد ہی اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی رائے میں کسی قسم کی جانبداری شامل نہیں ہوتی بلکہ وہ ادب کے مروجہ اصولوں اور تاریخ ادب کے مخصوص حصے کے بعد ہی اپنی رائے قائم کرتا ہے۔

تحقیق مشاہدے سے آگے بڑھ کر تجربے کی بنیاد کی حامل ہوتی ہے۔ اس لیے جب محقق اپنے رائے کا اظہار کرتا ہے تو تنقید کے اصولوں کے تحت ہی کرتا ہے اور اس سے باہر نکلنے یا الگ راستہ اپنانے کی غلطی نہیں کر سکتا۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب پوری دنیا کے زبان ہائے ادب میں ایک انقلابی کیفیت نمودار ہونے کو ہے۔ کیونکہ تمام ادبی تنقیدی و تحقیقی نظریات یکساں ہیں جن کو کڑی محنت سے تشکیل دیا گیا ہے۔ ان طریق ہائے تحقیق و تنقید کو دنیا کی تمام زبانوں میں یکساں طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

تنقید کی اصطلاح عام زندگی میں طنز و تشنیع کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ جن میں کسی فرد کی خرابیوں کے بارے میں گفتگو کی جاتی ہے۔ مگر ادب میں ''تنقید'' کی اصطلاح کسی فن کار یا فن پارے کی قدر و قیمت معلوم کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ تحقیق جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے معلومات فراہم کرتی ہے اور تنقید ان معلومات کو ایک ''انسان'' کے طور پر استعمال کرنے کا نام ہے جو فن پارے میں کھرے اور کھوٹے کو الگ کر کے قاری کے سامنے رکھتی ہے۔

تنقید کے حوالے سے لیسنگ ''Lessing'' کہا ہے۔

''فن کا ہر نقاد نابغہ ہے۔ (Genius) نہیں ہوتا۔ لیکن پر نابغہ فن کا پیدائشی نقاد ہوتا ہے۔''(۲۶)

## تقابلی مطالعات کا آغاز وارتقاء:

تقابلی مطالعوں کی اصطلاح اولین بار انیسویں صدی کے اوائل میں فرانس میں سنی گئی۔ جب اس عنوان کے تحت فرانس اور یورپ کی دیگر زبانوں کے ادب پاروں کا ایک انتخاب شائع ہوا۔ ۱۸۱۶ء میں جب پہلی بار تقابلی ادب کے عنوان سے مختلف مغربی زبانوں کے ادب کا انتخاب شائع ہوا تو اس اصطلاح کے یہ معنی ہونے اور اس میں وسعت آنے کے بارے میں ایک فکر کو زبردست تقویت ملی۔

پروفیسر سوزن بیسنٹ کے مطابق:

”تقابلی ادب کی اصطلاح مختلف ثقافتوں کے متون کا مطالعہ ہے۔ ایک کثیر العلمی مضمون ہے جس کا تعلق زمان اور مکان کے بعد میں پیدا ہونے والے ادب کے درمیان رشتوں کے نقوش سے متعلق ہے۔“(۲۷)

تقابلی ادب کے اصطلاح کی وضاحت یوں پیش آئی جب یورپی ملکوں نے دنیا کے دیگر ممالک پر قابض ہونے کی کوشش شروع کر دی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے یورپی ممالک کے مابین بدتر چپقلش کا آغاز ہوا۔ جن میں فرانس اور جرمنی، جرمنی اور انگلستان کے مابین جنگیں زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ یورپ کی دیگر طاقتوں نے جنگوں میں حصہ ڈالا۔ ان جنگوں میں لامبالغہ کروڑوں لوگ لقمہ اجل بن گئے۔ یورپی ممالک کے نوآبادکاروں نے مقبوضہ ممالک میں اپنی زبانوں کی ترویج کے ساتھ وہاں کی مقامی زبانوں میں اپنی استعداد بڑھانے میں اپنی کوششیں تیز تر کر دیں۔ یوں تقابلی ادب کے رجحان نے خوب فروغ پایا۔ جو نہ صرف ان ممالک کے لیے فائدہ مند ثابت ہوا۔ بلکہ اس کی بدولت مقبوضہ ممالک میں ان کے اثر ورسوخ میں بے بہا اضافہ ہوا۔

پروفیسر آرتھر مارش کے مطابق جس کو سوزن بیسنٹ نے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے:

”ادب کے مجموعی مظہر کا جائزہ، ان کا تقابل کرنا، گروہ بندی کرنا، قسم بندی کرنا، ان کے اسباب کی تحقیق اور نتائج کا تعین کرنا یہ ہے۔ تقابلی ادب کا اصل منصب۔“

ہر ملک نے ادب وزبان کو پرکھنے کے لیے اپنے اپنے اصول وضوابط مقرر کیے ہیں۔ ان اصول و ضوابط سے ان ممالک کی سوچ اور طریقہ تقابل کا واضح اظہار ہوتا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مختلف یورپی ممالک میں تقابلی ادب کا شعبہ تعلیمی اداروں میں اہمیت اختیار کرتا چلا گیا۔ اس روایت میں تین مکاتیب فکر کو زیادہ اہمیت حاصل ہیں:

۱۔ فرینچ سکول آف تھاٹ

۲۔ جرمن سکول آف تھاٹ

۳۔ امریکن سکول آف تھاٹ

## تقابل کے اصول وضوابط:

تقابل دراصل تحقیق اور تنقید کے مابین ایک نہ ختم ہونے والے رشتے کی بنیاد رکھتا ہے۔ اس لیے تقابل کے اصول تحقیق اور تنقید دونوں سے اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

جدید سائنسی دور میں جب انسان کے جینز اور ڈی این اے کے بارے میں کافی کچھ منظر عام پر آچکا ہے۔ ایسے میں تقابل کا کام بے معنی لگتا ہے۔ کیونکہ قدرت نے ہر شخص کے ڈی این اے میں بہت کچھ مماثل رکھنے کے ساتھ ساتھ ایسے اختراکات بھی موجود رکھے ہیں جو پہلے پہل انسانوں کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔ یوں جب قدرت نے کسی انسان کے ڈی این اے میں یکسانیت نہیں رکھی تو اس کے خیالات طرز عمل میں یکسانیت تلاش کرنا بے معنی لگتا ہے تاہم معاشرے میں رہتے رہتے جہاں ہر انسان دوسرے انسانوں سے کچھ سیکھتا ہے۔ وہی اپنی ذہنی استعداد کے مطابق اس میں کچھ نہ کچھ ترمیم کر لیتا ہے۔ یوں یہ ترمیم ناصرف زاویہ نگاہ میں تبدیلی کا عنوان ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ یہ علم اور مشاہدے کی انسانی فن کو مزید ترقی دینے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

دنیا کے مختلف خطوں میں موسم، رسم ورواج، لباس اور مذہب میں فرق ایک لازمی امر ہے۔ اس لیے جب مختلف خطوں میں ادب کی تخلیق ہوتی ہے تو ایک جیسے تجربات کو مختلف انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ داستانوں اور کہانیوں کا سننا اور سنانا۔ زمانہ قدیم سے ہی اس کا رواج مختلف انسانوں معاشروں میں رہا ہے۔ جن میں انسان کے تمام تر مشاہدات اور تجربات یکساں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ سہولیوں صدی میں جب یورپ

ایک طویل تاریک دور سے گزرنے کے بعد انگڑائی لے کر بیدار ہوا تو سائنسی ترقی ہی وہ بنیاد بنی جس کی بنا پر اس برعظیم میں بسنے والی مختلف اقوام نے دنیا کے وسائل پر قابض ہو کر اپنے ملکوں کی ترقی کا سوچا یوں صنعتی دور میں داخل ہوتے ہیں۔ یورپ میں ایسی تحریکیں شروع ہوئیں۔ جن کی مدد سے اپنی قوم کو سائنسی اور تکنیکی ترقی سے بہرہ مند کر کے انہیں دیگر دنیا کے وسائل پر قبضہ کرنے کے لیے تیار کرنا تھا۔ جب ان ممالک نے اپنی افواج کو دوسرے ممالک پر لامحدود وقت کے لیے قبضہ کرنے کے لیے بھیجا تو ایسے میں ان کے ادب اور روایت سے خبر دار رہنا یورپی اقوام کے لیے لازمی ہو گیا۔ فرانسیسی، پرتگالیوں، امریکن اور دیگر اقوام کے فن پاروں کی درجہ بندی کے لیے جن اصول وضوابط کو اختیار کیا۔ ان میں چند اشتراکات اور افتراکات موجود ہیں۔

تقابلی تنقید کی سب سے مقبول صورت تو یہی ہے جن میں دو فن کاروں یا ادیبوں کے فن وادب کو سامنے رکھ کر ان کی خصوصیات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ یورپی زبانوں میں تنقید و تقابل کی روایت خاصی قدیم ہے مگر اردو میں یہ روایت انیسویں صدی میں سامنے آئی۔ جب سرسید نے ایڈیسن اور اسٹیل کی طرز پر پہلی مرتبہ "Essay's" لکھنے کا دعویٰ کیا۔ اس بنا پر سرسید کا ان دونوں انشا نگاروں سے تقابلی مطالعہ لازمی ہو جائے گا۔

بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> "اردو کے تقریباً سبھی قابل ذکر نقاد مختلف صورتوں میں تقابلی تنقید سے کام لیتے رہے ہیں جس کا مصروف انداز غیر ملکی ادیبوں سے تقابل کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ "بقدر ہمت اوست" ہمارے نقاد (انگریزی) فرانسیسی، امریکی اور روسی ادیبوں سے تقابل کے بعد اپنے ادیبوں کی عظمت اور اہمیت ثابت کرتے ملتے ہیں۔"[۲۹]

تقابل کی کئی صورتیں ادب کے مختلف متون میں نظر آتی ہیں جن کا تذکرہ مختلف ادیبوں نے اپنی اپنی تنقید میں ذکر کیا ہے۔ تقابلی ادب کے ان عالمی اصول وضوابط کا مندرجہ ذیل نکات میں مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ جب کوئی محقق یا نقاد تقابلی تنقید سے کام لیتا ہے۔ تو اس کے لیے وہ دو ادبی فن پاروں کو سامنے رکھتا ہے اور ان فن پاروں کی مدد سے دونوں ادبا میں اشتراکات اور اختلافات تلاش کرنے کی سعی کرتا ہے۔ یہ تلاش کئی سطحوں پر مبنی ہوتی ہے۔ مثلاً فکری تقابل، زبان وبیان کا تقابل، زمانی تقابل اور معاشرتی تقابل ان تمام تقابل سے گزار کر ایک تقابل کرنے والا نقاد کسی فن پارے کو دوسرے فن پارے پر ترجیحی دیتا ہے۔ اس کی مثال موازنہ انیس ودبیر ہے۔ جس میں شبلی نے زور بیان سے مرزا سلامت علی دبیر پر میر انیس کی اہمیت واضح کی ہے۔

۲۔ تقابل صرف ایک زبان کے دو فن پاروں کے مابین نہیں ہوتا۔ بلکہ دو زبانوں کے ادیبوں یا ادبی فن پاروں کا بھی ہو سکتا ہے۔ جدید دور میں جب انسان ہر گزرتے دن کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب آتے جارہے ہیں، خیالات اور رسم ورواج میں کسی حد تک یکسانیت پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ جب ایک معاشرہ دوسرے معاشرے سے اثر قبول کرتا ہے تو اس کے ادب کا دوسرے ادب کے ساتھ غیر محسوس لیکن ایک مضبوط تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے اثرات آہستہ آہستہ دوسری زبان میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک نقاد اور محقق زبان وبیان اور فکر کے ساتھ ساتھ ادیبوں کے عمومی تاثرات لے کر اپنے نتائج اخذ کرتا ہے۔

۳۔ تقابل ایک ہی زبان اور ادوار کے مابین بھی ہو سکتا ہے یا ایک شاعر کے مختلف ادبی ادوار کا بھی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً علامہ اقبال کی شاعری اور سیاسی زندگی کے مختلف ادوار کا تقابلی جائزہ عموماً اقبالیات کی اہم تصنیف کی زینت ہوتا ہے جو نا صرف اقبال کی شاعری اور فکر تبدیلی کو واضح انداز میں دیکھنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ بلکہ اس میں موجود اشتراکات اور اختلافات کو قاری کے سامنے

رکھ دیتا ہے۔ اسی سے ملتا جلتا تقابلی تنقید کا ایک اہم رویہ اُردو کے مابین تقابل کا بھی ہے۔ جب کوئی محقق تاریخ ادب کے کسی باب سے متعلق بات کرتا ہے تو اس سے پہلے اور بعد میں ہونے والی تبدیلیوں میں مختصر مگر جامع تجزیہ اُس تنقید کا لازمی حصہ ہوتا ہے۔

۴۔ تقابل کا ایک اور انداز جو موجودہ دور میں ترقی پا رہا ہے وہ مختلف زمانوں میں ایک ہی زبان کے اندر ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ ہے۔

۵۔ تقابل صرف ادبی متون کے مختلف انداز سے جائزہ کو ہی نہیں کہتے بلکہ تقابل کے دوران انسان کی نفسیاتی تشکیل اور دوسرے ادیب کے ساتھ ان کی نفسیاتی مماثلت اور اختلاف کا بھی جائزہ پیش کرتا ہے۔ یوں تقابلی تنقید کے یہ اصول وضوابط مختلف طریقوں فن پاروں تاریخ ادب کے مختلف دھاروں کا بھی جائزہ لینے میں مدد ومعاون ہوتے ہیں ۔ تاہم تقابل کرتے وقت توازن اور غیر جانبداری کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔ اسی صورت میں ہی تقابل صحیح نتائج اخذ کرنے میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔

تقابل کی اہمیت وافادیت، تقابلی ادب کی اہمیت یہ ہے کہ یہ ہمیں ایسا پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے۔ جس کی مدد سے ہم جغرافیائی حدود وقیود سے ماورا ہو کر دنیا کی تمام ادبی زبانوں کا ادبی اثاثہ اپنے فکر زاویے کے ساتھ ساتھ پڑھنے میں یا پرکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ یہ ہماری سوچوں کی سرحدوں کو نا صرف وسعت دیتا ہے بلکہ ان میں گہرائی وگیرائی بھی پیدا کرتا ہے اور ہم صحیح نتیجے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

## حوالہ جات


۱۔ فیروزالدین مولوی، فیروز اللغات، اردو جامع نیا ایڈیشن، فیروز لمیٹڈ، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص۶

۲۔ شان الحق حقی، مرتبہ: فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان (طبع سوم)، ۲۰۰۸ء، ص۱۱۲

۳۔ Urdu English Dictionary (Revised Edition) Ferozsons (PVT) LTd, 1991, P. 4

۴۔ The Penguin Dictionary of Literary terms and literary theory, Fourth Edition, J. A. Cuddon, 1998, P. 63

۵۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اصناف ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص۱۶۲

۶۔ وہاج الدین علوی، ڈاکٹر، خودنوشت فن و تجزیہ، جامعہ خلیہ اسلامیہ دہلی، ۱۹۸۹ء، ص۴۱

۷۔ محمد طفیل، تصریحات، نقوش، آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۴ء

۸۔ سرور آل احمد، خواب باقی ہیں، فکشن ہاؤس لاہور، ۱۹۹۴ء، ص۸

۹۔ مشفق خواجہ، مختصر آپ بیتیاں، سہ ماہی، الزبیر، آپ بیتی نمبر بہاولپور، شمارہ۷، ۱۹۶۷ء، ص۵۴

۱۰۔ عبدالمجید قریشی، آپ بیتی اردو ادب میں مشمولہ سہ ماہی، الزبیر، آپ بیتی نمبر، اردو اکادمی، بہاولپوری، ۱۹۶۴ء، ص۲۹

۱۱۔ سالک علم الدین، آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو، مشمولہ نقوش، آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص۴۰

۱۲۔ ایضاً، ص۵۶

۱۳۔ ندیم احمد، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں خود نوشت سوانح عمری، مشمولہ خدا بخش لائبریری، جرنل ٹپنز، شمارہ ۱۲۹ء، جولائی ۲۰۰۲ء، ص۱۱۵

۱۴۔ انصاری یوسف جمال، آپ بیتی کی مختلف صورتیں، مشمولہ نقوش آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص۷۰

۱۵۔ ندیم احمد، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں خود نوشت سوانح عمری، ص۱۱۴

۱۶۔ سالک علم الدین، آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو، ص۵۳

۱۷۔ انصاری، یوسف جمال، آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں، ص۴۳

۱۸۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، تذکرہ نگاری کا فن اور اردو شعراء کے تذکرے مشمولہ اردو ادب کی فنی تاریخ، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص۸۷

۱۹۔ انصاری، یوسف جمال، آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں، ص۴۷

۲۰۔ ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر، داستان تاریخ رپورتاژ نگاری، ادارہ علم و فن پشاور، ۱۹۹۹ء، ص۵۹۔

۲۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نشان جگر سوختہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص۱۱

۲۲۔ ایضاً، ص۱۱

۲۳۔ سالک علم الدین، آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو، ص۴۱

۲۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اوّل، ۱۹۹۲ء، ص۱۳۴

۲۵۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اوّل، ۱۹۸۵ء، ص۱۸۹

۲۶۔ لیسنگ (قول) مشمولہ: مغرب کے تنقیدی اصول، سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع ہفتم، ۲۰۱۲ء، ص۱۶

۲۷۔ سوزن بیسنٹ، تقابلی ادب ایک تنقیدی جائزہ، مترجم توحید احمد، یورپ اکادمی اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص۵

۲۸۔ پروفیسر آرتھر مارش، مشمولہ: سوزن بیسنٹ، تقابلی ادب: ایک تنقیدی جائزہ، مترجم توحید احمد یورپ اکادمی اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص۵۱

۲۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی دبستان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص۷۷

## باب دوم:

# شیخ رشید اور عبدالمجید ملک کی آپ بیتیوں میں سیاسی شعور کا تقابل

## الف: سیاست کیا ہے؟

### سیاست اور سیاستدان:

سیاست عربی زبان کا لفظ ہے۔ سیاست سے مراد حکمت و دانائی اور سوچ مراد لی جاتی ہے۔ سیاست سے مراد ریاستی باشندوں کے مسائل کو ارباب اختیار تک پہنچانے اور ان مسائل کی خاطر تجاویز پیش کرنے کا نام سیاست کہلاتا ہے۔ اس کا آغاز یونان قدیم کی شہری ریاستوں سے ہوا۔ چنانچہ انگریزی لفظ "پالٹکس" (Politics) سیاست یونانی زبان کے لفظ (Polis) سے نکلا ہے۔ جس کے معنی شہر یا شہری ریاست کے ہیں۔

قدیم یونانی ریاستوں میں سیاست کا تعلق ہر اس اَمر سے وابستہ ہے جو ریاست کے متعلق ہو۔ سیاسی عمل کی تکمیل کی خاطر قدیم یونانی ریاستوں میں جمہوریت کا تصور بڑی حد تک موجود تھا۔ جس میں باقاعدہ مخصوص لوگوں کی رائے لے کر حکومت تشکیل دی جاتی تھی۔ یوں سیاست دان کے لفظ کا اطلاق ایسی شخصیت کی خاطر مستعمل ہوتا ہے جو معاشرے کے مجموعی تاثر اور رائے کو نا صرف بیان کرتا ہے بلکہ اقتدار میں آنے کے بعد مقتدر طبقات تک عوامی مسائل لے جانے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ بلکہ مسائل کے حل کی خاطر تجاویز بھی پیش کرتا ہے۔ یوں سیاست دان ایسا ماہر نباض ہوتا ہے۔ جس کا ہاتھ معاشرے کی نبض پر ہوتا ہے اور ہمہ وقت عوامی مزاج کے بدلتے ہوئے رویوں سے بھی روشناس رہتا ہے۔ کامیاب سیاست دان کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ بدلتے ہوئے عوامی مزاج کے مطابق اپنی پالیسیوں کو بھی تبدیل کرے اور بروقت فیصلے کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔

سیاست دان نا صرف ہر وقت کی بدلتی ہوئی مجموعی صورت حال سے واقف ہوتا ہے بلکہ روز مرہ میں جو مسائل در پیش ہوتے ہیں ان کے حل کی خاطر بہتر اقدامات اٹھانا ہوتے ہیں۔ جو عوامی امنگوں کے ترجمان ہوتے ہیں۔ سیاست دان مجلس شوریٰ میں عوامی رائے کے مطابق قوانین کو تشکیل کر کے معاشرتی زندگی کو آسان سے آسان تر بنانے کی ہر ممکن تگ و دو کرتے ہیں۔

تعلیم ایک ایسا آلہ ہے جو عوام میں سیاسی شعور بیدار کرنے کا سبب بنتا ہے اور وہ برے بھلے لوگوں کے درمیان تفریق پیدا کر کے بہتر افراد کو اقتدار کی غلام گردشوں تک پہنچانے میں مدد دیتے ہیں۔ معاشرہ ابتدا میں بہت سادہ اور واضح تھا۔ مگر آبادی بڑھنے اور شہروں کے قیام کے ساتھ ساتھ زندگی کے تقاضے پورے کرنے کی وجہ سے معاشرہ موجودہ صورت میں نہایت گنجلک اور پیچیدہ ہو چکا ہے۔ ان تمام پیچیدگیوں سے اچھی طرح نبرد آزما ہونے کے لیے موجودہ جدید ریاستوں میں نمائندوں کی ایک سیاسی "مجلس شوریٰ" تشکیل دی جاتی ہے جو معاشرتی، معاشی اور سیاسی ہر اعتبار سے عوامی امنگوں کی ترجمان ہوتی ہے۔ سیاست دانوں کی اہمیت وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔ کیونکہ پیچیدہ معاشرتی نظام میں کس کے پاس اتنا وقت نہیں کہ اپنے تمام تر داخلی اور خارجی مسائل کو حاکم وقت کے گوش گزار کر سکے۔ لہٰذا یہ نمائندے معاشرت اور اقتصاد سے وابستہ ہر ممکن مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نت نئی پالیسیوں کی بدولت مختلف معاشروں کو مشترک بنیادوں پر یکجا کر کے ان کی ترقی اور خوشحالی کی سمت کا تعین کرتے ہیں۔

## سیاست کے بارے میں مختلف دانشوروں کی آراء:

فرہنگ تلفظ کے مطابق:

"سیاست کے معنی حکمرانی، حکمت عملی، ملکی امور مصلحت اندیشی حصول اقتدار، اور تحفظ مفادات کے لیے جدوجہد ہے۔"[1]

قومی انگریزی اردو لغت کے مطابق:

"قومی انگریزی اردو لغت میں "سیاست" سے مراد حکومت کاری کا علم، کسی حکومت، قوم یا کسی ملک کی حکمت عملیاں اور مقاصد سیاسی جماعتوں کے طور طریقے اور ان کے مقابلے سیاسی معاملات، کسی شخص کے سیاسی روابط یا عقائد ان لوگوں کی ریشیہ دوانیاں یا منصوبہ بندیاں جو ذاتی طاقت شان وشوکت، منصب یا اسی قسم کے دیگر مقاصد جو یا ہوں۔"[۲]

جامع علمی اردو لعت میں سیاست کے معنی:

"(۱) حفاظت، نگہبانی، نظام، معاملات ملکی (۲) ملک کی حفاظت، گنہگاروں کی سزا (۳) راعب داب، دبدبہ (۴) سختی، قہر وغضب (۵) خوف، دہشت (۶) دھمکی، مار پیٹ، باز پرس۔"[۳]

فرہنگ آصفیہ کے مطابق:

جمع کے الفاظ عام طور پر واحد فعل کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس کا استعمال دیکھیں:

۱۔ سیاسی گورنمنٹ کا فن یا سائنس سیاسیات

۲۔ پالیسیاں، مقاصد یا معاملات کسی بھی حکومت، گروہوں یا اس میں موجود مختلف پارٹیوں کے۔

۳۔ (a) اکثر پیشہ ورانہ طور پر سیاسی معاملات میں مصروف ہونا اور طے کرنا۔

(b) کسی بھی شخص کا کاروبار، معاملات یا پیشہ

۴۔ کسی بھی ریاست یا حکومت کے کاروبار میں طریقہ کار

۵۔ سیاسی معاملات میں باریک بینی اور مختلف آراء

۶۔ سیاسی معاملات سے تعلق رکھنے والے اصول اور رائے

"لفظ سیاست کے لغوی معنی ملک کی حفاظت و نگرانی، حکومت و سلطنت انتظام ملک، بندوبست اور نظم و نسق کے ہیں۔"(۴)

سیاست سے مراد ایسا علم لیا جاتا ہے جو ریاست اور حکومت کے سیاسی مسائل کو زیر بحث لائے۔ جو کوئی فرد سیاست میں قدم جماتا ہے تو اس کے سامنے عصر حاضر کے وہ تمام مسائل ہوتے ہیں جو قانون سازوں کی قوم پر چاہتے ہیں۔

امریکی مصنف سلٹاؤ (Saltau) نے سیاست کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔

سلٹاؤ (Saltau) کے مطابق:

"لغوی طور پر اس میں ہر وہ چیز شامل ہے جس کا تعلق شہر (Polis) سے ہے یا پھر یوں کہا جائے کہ "معاشرے" سے ہے۔ کیونکہ شہر اب اجتماعی زندگی کی ایک (مکمل اور آزاد) اکائی نہیں رہے۔"(۵)

ارسطو کے مطابق:

"سیاست ایک علم بھی ہے اور فن بھی ہے۔"(۶)

گویا سیاست سماجی زندگی کا وہ لائحہ عمل ہے جو کسی علاقے ملک یا ریاست کے کاروبار حکومت کو سنبھالنے اور سیاسی عمل عوام الناس اور ریاست کے درمیان پل کا کردار ادا کرتا ہے۔

ڈیگارٹس کے مطابق:

"ریاست ایک مشین کی حیثیت رکھتی ہے اور شہری اس کے پرزے ہیں۔"(۷)

سیاست طاقت کا ایک ایسا سرچشمہ ہے جس کے ذریعے ایک انسان دوسرے انسانوں کے معاملات کو سنبھالنے کی جدوجہد کر رہا ہوتا ہے۔ سیاست ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے ایک انسان دوسرے

انسان کی نجی زندگی میں دخل انداز ہوتا ہے۔ جو انسانوں کو انفرادی اور مجموعی زندگی کی خاطر ایک مخصوص حکمت عملی اختیار کرنے پر مجبور کر سکے یا ترغیب دے سکے۔ ارسطو نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف (Politics) کی ابتداء ان الفاظ سے کرتا ہے کہ انسان فطرت کے اعتبار سے ایک سیاسی حیوان ہے۔ ارسطو کا اس سے یہ مطلب ہے کہ سماجی زندگی کی حقیقت سیاست (Politics) میں پوشیدہ ہے اور معاشرے کے بغیر انسانی زندگی نامکمل ہے اور اس طرح سیاسی معاشرہ یعنی ریاست کے بغیر بھی اس کی زندگی نامکمل ہے۔ کیونکہ ریاست کی رکنیت اختیار کر کے ہی فرد میں تہذیب و تمدن سے واقفیت اور سیاسی بصیرت پیدا ہوتی ہے۔

کیونسی رائٹ (Quincywright) کے مطابق:

> "سیاست سے مراد وہ فن ہے جس کے ذریعے کچھ گروہوں کو متاثر کر کے سبکدوشی سے گھٹ جوڑ یا کنٹرول کر کے دوسروں کی مخالفت میں کسی ایک گروہ کے مقصد کو فروغ دیا جاتا ہے۔"[۸]

سیاست ایک ایسا لائحہ عمل ہے جس کے ذریعے سے ایک انسان بہت سے لوگوں پر غالب آجاتا ہے۔ وہ کوئی بھی فیصلہ کریں جس کے مطابق لوگوں کو اس فیصلے پر عمل درآمد کرنا پڑے۔

مشہور شاعر "انور شعور" یوں رقمطراز ہیں:

گنوانے اور کھونے کے بجائے

کمانے کی مہارت ہے سیاست

نہیں ہوتا کبھی نقصان جس میں

وہ سوداوہ تجارت ہے سیاست [۹]

یونانی "سیاست" کو وسیع معنوں میں لیتے ہیں۔ یہ لفظ یونانی لفظ شہر ریاست سے بنا ہے۔

ارسطو اپنی کتاب "Politics" میں یوں رقمطراز ہیں:

"Man is by nature a Political animal"

"فطری طور پر انسان ایک سیاسی جانور ہے۔"[۱۰]

اس سے مراد یہ ہے کہ ہر جاندار کو جو حق دیا گیا ہے وہ سیاست کہلاتا ہے اور کسی خاص مقصد کی خاطر جب دو افراد آپس میں جڑتے ہیں تو وہ ایک سیاسی عمل ہوتا ہے۔ جیسے کہ سوسائٹی میں موجود لوگوں کے مسائل کو بیان کیا جاتا ہے اور دوسروں کو اپنا نقطہ نظر سمجھانے میں متاثر کرتے ہیں۔ تو وہ اپنے آپ کو سیاست میں مصروف عمل پاتے ہیں۔یعنی دوسرے بہت سے لوگ ان کے نقطہ نظر سے متفق ہوتے ہیں۔

سیاست ملک کے سیاسی حالات اور حکومت کے کاموں میں دشواریوں سے متعلق ہوتی ہے جو کہ دنیا کے سب ملکوں میں یکساں نہیں ہوتی اور سیاست محض اقتدار کی غلام گردشوں کا نام ہے۔ اس میں اولیت مفاد حکمت عملی کو ہوتی ہے۔

ویبسٹر ڈکشنری (Webster Dictionary) کے مطابق:

1. (a) The art or science of government

   (b) The art or science concerned with guiding or influencing governmental Policy.

   (c) The art or science concerned with winning and holding control over a government.

یعنی:

۱۔ سیاست حکومت سازی کا فن یا سائنس (علم) ہے۔

۲۔ حکومتی پالیسیوں کی رہنمائی یا متاثر کرنے کرنے والا فن یا سائنس۔

۳۔ حکومت پر اختیار حاصل کرنے اور سنبھالنے کا فن اور سائنس ہے۔

2. Political actions Practices or Policies.

سیاسی کام، امور یا پالیسیاں:

3. (a) Political affairs or business especially: Competition between competing interest group or Individuals for Power and leadership (as in a government)

سیاسی معاملات یا کاروبار، خاص طور پر دلچسپی رکھنے والے افراد یا جماعتوں کے درمیان طاقت یا قیادت کے لیے مقابلہ یا کوشش ہے۔

(b) Political life especially as a principal activity or Profession.

سیاسی زندگی ایک بہت اہم کام یا پیشے کے طور پر۔

(c) Political activities characterized by art ful and often dishonest practices.

سیاسی امور جن میں فنی مہارت اور دھوکہ دہی کے کام ہوتے ہیں۔

4. The political opinions or sympathies of a Person.

ایک شخص کی سیاسی رائے اور ہمدردیاں۔

5. (a) The Total complex of relations between people living in society.

ایک معاشرے کے اندر رہنے والے لوگوں کے درمیان پیچیدہ تعلقات۔

(b) Relations or conduct in Particular area of experience especially as sean or dealt with fom a political point of view.

ایک طریقے پر مبنی لوگوں کے تعلقات اور رویے جو کہ سیاسی نقطہ نگاہ سے دیکھے یا لیے جاتے ہیں۔[۱۱]

## سیاسی شعور:

## شعور کیا ہے؟

شعور عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے کہ آگاہ ہونا، واقف ہونا یا علم کے ہیں۔ کسی کام کے بارے میں حکمت عملی کا جو طریقہ کار اپنایا جاتا ہے وہ شعور کہلاتا ہے۔

شعور کو انگریزی میں (Consciousness) کہتے ہیں اور اس کو انگریزی میں (Awarness) بھی کہا جاتا ہے۔

کیمبرج ایڈوالسنڈ نرزڈ کشنری (Consciousness) کی تعریف یوں کی ہے:

"The state of being awake thinking and knowing what is happening around you."[۱۲]

"یعنی بیداری کی حالت سوچنا اور اس بات کا ادراک رکھنا کہ آپ کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔"(۱۳)

قومی انگریزی اردو لغت:

قومی انگریزی اردو لغت میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے شعور کو ان الفاظ سے بیان کیا ہے:

"شعور کے معنی احساس آگاہی، وقوف علم، باشعور یا آگاہ ہونے کی حالت، کسی چیز کی داخلی حیثیت، ذاتی وجود، حسیات اور معلومات کا وقوف، اور مجموعی طور پر ایک فرد یا عوام کے اوسط خیالات اور احساسات کا علم شعور کہلاتا ہے۔"(۱۴)

جامع علمی اردو لغت:

"شعور کے معنی دانائی عقل سلیقہ، ہوش، واقفیت اور پہچان ہونا ہے۔"(۱۵)

## سیاسی شعور کیا ہے؟

سیاسی شعور کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص مجموعی طور پر معاشرے کی صورت حال سے آگاہ ہونے کی کوشش کرتا ہے اور معاشرتی مسائل کے حل کے لیے تجاویز پیش کرتا ہے اور بالا دست "طبقات" یعنی حکمرانوں کو عوام کے اجتماعی مسائل سے آگاہ کرتا ہے تو یہ جدوجہد سیاسی شعور کے زمرے میں آتی ہے۔

ہر ملک کے لوگ اپنی ضرورتوں جغرافیائی محل وقوع، سماج اور رسم ورواج کو پیش نظر رکھ کر ایک سیاسی نظام کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ تشکیل ان کے رجحانات اور زندگی کے بارے قومی تصور کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ دنیا کی تاریخ، کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہر معاشرے نے ابتدا میں کسی نہ کسی شخص کو اپنا سربراہ بنایا جو بعد میں سردار بادشاہ، شہنشاہ، خلیفہ، یا کسی اور نام سے موسوم ہو کر حکومت کرتا رہا۔ جس کی

وجہ سے اس کا عوام الناس پر رعب و دبدبہ بھی قائم رہا اور ریاست اور عوام اس کے طابع رہی اور ان میں سے چند حکمران ایسے بھی گزرے ہیں جو عوام کی بہتری، اور بنیادی وسائل کی فراہمی کے لیے کوشاں رہے اور اس چیز کی تگ و دو میں رہے کہ اس کے بعد اس کا خاندان لوگوں کی تقدیر کا مالک بنا رہے۔ تاہم گردش ایام کی وجہ سے کئی شاہی خاندان اپنی جاہ و جلال اور حشمت کو چھوڑ کر ذلتوں سے ہمکنار ہو گئے اور آج ہم تاریخ میں صرف ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں اور ان کے زوال کے پس و پشت اسباب کو جاننے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اسی سے متاثر ہو کر سولہویں صدی میں یورپ جب ''نشاط ثانیہ'' سے گزر رہا تھا تو سیاسی مفکرین نے دنیاوی تاریخ کا جائزہ لے کر ایک ایسا نظام تشکیل دینے کی بات کی جس میں زمام اقتدار بادشاہ کے ہاتھ میں دینے کے بجائے عوام کے ہاتھ میں دینے کی جانب سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا تاکہ زوال سے آشنا ہونے والے ہر سیاسی نظام کو ختم کر کے ایسا نظام لایا جائے جو طویل ترین عرصے تک قائم رہنے میں انسانوں کی مدد کرے اور معاشرے میں افہام و تفہیم اور برابری کا تصور لائے تو یہ شعور سیاسی شعور کہلایا۔ چونکہ یورپی نوآبادکار اپنے ملکوں میں یہ نظام لا چکے تھے۔ اس لیے اپنے مقبوضہ علاقوں میں اس نظام کی تشکیل کرنے میں لوگوں کی بھرپور مدد کی۔ انگریز سے مستعار لیا گیا یہ پارلیمانی نظام برصغیر پاک و ہند کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی نفاذ پذیر ہے۔ اسی طرح امریکہ کا صدارتی نظام تھوڑے بہت اختلاف کے باوجود برطانوی نظام کی طرح ہی ہے۔ جس میں اختیارات وزیراعظم کی مانند صدر کو ہوتے ہیں۔ تاہم چناؤ کا طریقہ کار مختلف ہونے کی وجہ سے اس کو صدارتی نظام کا نام دیا گیا۔ سیاسی شعور عوام میں صحیح رائے دینے اور بہتر انتخاب کے علاوہ اپنے حقوق اور فرائض سے پوری طرح باخبر ہونے کا نام ہے اور عوام اپنی سیاسی بلوغت اور تعلیم کی بنا پر اپنی اپنی پسند کی سیاسی جماعتوں جن کے منشور سے بظاہر مطمئن ہوتے ہیں اور اپنے اپنے پسند کے لیڈروں کو ووٹ دیتے ہیں جن کو وہ اپنے حقوق کا حقیقی ترجمان سمجھتے ہیں۔

سیاسی شعور، سیاسی داؤ پیچ اور سیاسی فہم و فراست کا نام ہے۔ یہاں ہمہ وقت سیاست، ریاست اور عوام والناس سے ہر وقت باخبر رہنا پڑتا ہے۔ سیاست میں کوئی چیز حرف آخر نہیں ہوتی۔ سیاست میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ ہر وقت فیصلے کرنے کی صلاحیت اور موقع کی مناسبت سے افہام و تفہیم کے

ساتھ ساتھ کسی چیز کے بارے میں رائے قائم کرنا سیاسی شعور کی عکاس ہوتی ہے۔ سیاسی ادراک اور جدوجہد سے سیاست سے زندگی کی نئی راہیں متعین ہوتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ کسی تہذیب و تمدن کے عمومی خصوصی رویے اور مختلف زاویوں سے اس کے متعلق آگاہ ہونا بھی سیاسی شعور کے زمرے میں آتا ہے۔

سیاسی شعور کا مقصد یہ ہے کہ جب کوئی عوامی نمائندہ، یا پھر شہری، ریاست، عوام اور حکومت کے درمیان تعلقات کی بات کرتا ہے تو دراصل وہ اپنے سیاسی شعور سے دوسرے لوگوں کو آگاہ کرتا ہے اور وہ امور حکومت و حکمرانی کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے اور حکومتی کارکردگی پر کھل کر بات کرتا ہے۔ اس کے اچھے کاموں اور کارگردگی کی تعریف اور ناقص پالیسیوں اور کارکردگی پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ اسی طرح ایک عام شہری کا اپنی ریاست کے قانون، امور حکمرانی و حکومت بمع حدود و قیود اور بحیثیت ریاستی نمائندے کے اپنے حقوق و فرائض سے واقف ہونے کا نام سیاسی شعور کہلاتا ہے۔ سیاسی شعور حقیقت میں سیاسی جان پہچان، سیاسی داؤ پیچ اور سیاسی عمل ریاستی باشندوں اور ریاست کے درمیان واسطے کا نام ہے۔ ہر باشعور اور تعلیم یافتہ انسان کسی نہ کسی نظام، حکومت، اور سیاسی ماحول سے متاثر ضرور ہوتا ہے اور جب وہ اس سے متاثر ہو کر اپنے تجربے اور سوچ و فکر اور علم کی بدولت کسی نظریئے کا پرچار کرتا ہے یا اظہار کرتا ہے تو وہ یہ اس کے سیاسی شعور کی بدولت ہوتا ہے۔ پس جب کوئی عوامی نمائندہ، تجزیہ نگار، تبصرہ نگار یعنی مبصر یا پھر قلم کار اس نوعیت کی تجاویز توقعات یا رائے پیش کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کوئی ادیب یا شاعر بھی اس مرحلے سے گزر کر کوئی فن پارہ تخلیق کرتا ہے تو وہ اس کے سیاسی شعور کا ادراک ہوتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی قومی انگریزی اردو لغت میں سیاسی شعور کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

قومی انگریزی اردو لغت:

> ''سیاسی: یہ عربی لفظ ہے۔ قومی انگریزی اردو لغت میں اس کے معنی ''حکومت کا ایک متعین یا باقاعدہ نظام، یا انتظامی ادارہ رکھنے والا شہری حکومت اور اس کے انتظامی ادارے سے متعلق، مملکت کے معاملات یا قومی قوانین و تدابیر میں دلچسپی رکھنے والا، کسی قوم یا مملکت یا اقوام اور مملکتوں سے متعلق ہو۔''(۱۶)

ارسطو کے مطابق:

"انسان فطرۃً ایک سیاسی حیوان ہے۔"(۱۷)

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جاندار کو بنیادی طور پر جو حق دیا گیا ہے اور اس حق کی خاطر جدوجہد کرنا سیاسی شعور کہلاتا ہے اور انسان کو اپنے نظم نسق اور اپنے تحفظ کی ضرورت ہمیشہ درکار ہوتی ہے اور اس کی سوچ و بچار میں یہ چیز ہمیشہ کارفرما ہوتی ہے۔ کہ اس کی ترقی اور حفاظت کسی سیاسی عمل کے بغیر ناممکن ہے۔ کیونکہ حقیقت میں سیاست طاقت کا وہ سرچشمہ ہے۔ جس کی بدولت ایک انسان بہت سے لوگوں پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے اور کسی ایک شخص کا بہت سے لوگوں کو مغلوب کر لینا اس ایک شخص کے سیاسی شعور کا واضح ثبوت ہوتا ہے۔ چنانچہ زمانہ قدیم میں انسانوں کے اندر بیرونی حملہ آوروں سے بچاؤ اور فتوحات کے شوق کی وجہ سے سیاسی شعور بیدار ہوا۔

ابتداء آفرینش میں انسان کسی جگہ مستقل سکونت اختیار نہیں کرتے تھے اور نہ ہی گنجان آبادیوں کا رواج تھا۔ بلکہ یہ خانہ بدوشی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا اور اپنی خوراک کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے شکار کیا کرتے تھے اور اس کے بعد جب ابن آدم نے ایک جگہ اپنی رہائش کے لیے سکونت اختیار کی تو کھیتی باڑی شروع کر دی جس سے بہت سی تبدیلیاں سامنے آئیں اور بتدریج آبادی میں اضافہ ہونے لگا اور کاشت کاری کی وجہ سے لوگ خوشحال ہو گئے اور لوگوں کی زندگیوں میں سکون میسر آیا اور کثرت دولت کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کے قریب ہوئے۔ جس کی وجہ سے زمین اور مالک کے تصور نے جنم لیا اور معاشی زندگی میں ترقی رونما ہوئی۔ ان تبدیلیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک ایسی تنظیم کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا جو اندرونی اور بیرونی طور پر مکمل لوگوں کو تحفظ فراہم کر سکے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ لوگوں میں سیاسی شعور کا باقاعدہ احساس بہت بعد میں ہوا۔ جب انسانوں کے اندر سیاسی شعور بیدار ہوا تو ریاست وجود میں آئی۔ سیاسی شعور جیسے جیسے پروان چڑھا تو اس کے ساتھ ساتھ نظم و نسق یعنی ریاست کو چلانے کا نظام اور آئین اور ریاست محبت کا جذبہ بھی پیدا ہوا یعنی حب الوطنی کا جذبہ اور یوں تمام عناصر نے ریاست کی تشکیل میں مدد پہنچائی۔

سیاسی شعور کو ہم ریاست، حکومت اور عوام کے درمیان جو رابطہ ہوتا ہے اس کو عمل کرنے کے طریقے میں بیان کرسکتے ہیں۔ اس کی مدد سے انسانی حقوق کی حفاظت، عدل، سماجی، سیاسی صورتحال کو سمجھنا اور معاشی نظام اور غیر مساویانہ سلوک کے رابطے اور اقدار کو سمجھنے کی سعی کرنا ہے۔

سب سے پہلے اس لفظ سیاسی یا سیاست کی (جڑوں) کی ابتدا کو سمجھنا ہے کہ یعنی جس منفی رد عمل کا اظہار ہے۔ سیاست کا لفظ یونانی زبان کے لفظ "پالس" "Polis" سے ماخوذ ہے۔ جس سے مراد شہرت یا ریاست لیا جاتا ہے۔ اس کا تعلق معاشرے کی زندگی سے ہوتا ہے۔

ہمارے نزدیک سیاست کا مطلب "سیاسی شعور اور سیاسی جدوجہد سے مراد لیا جاتا ہے کہ بحیثیت مجموعی لوگوں کی بہتری کو سامنے رکھنا ہے اور سیاسی لائحہ عمل کے ذریعے سے ہی لوگوں کی بہتری کے لیے کام کیا جاتا ہے۔ یہ ظلم وزیادتی سے نفرت کے اظہار کا طریقہ و سبب ہے۔ ساتھ ہی ایک دوسرے کی عزت و احترام اور مل جل کر کام کرنے کا فن ہے۔ دوسرے کو اپنا ہمدرد اور ساتھی تصور کرنا جو کہ معاشرتی دباؤ میں قابل تعریف ہو، جو سب باہم مل کر معاشرے میں موجود لوگوں کی بہتری اور وقار کے لیے جدوجہد کر رہے ہو۔

معاشرتی سوچ وبچار کی بنیاد اگر تنقیدی نقطہ، نظر، مضبوطی اور پائیداری کی اقدار اور نفسیاتی حقوق پر رکھی جائے، تو یہ ایک بہت بڑی جستجو چھان بین اور تلاش ہے کہ ہم کون ہیں۔ ہمیں کیسے زندگی گزارنی ہے اور ہمارے اخلاق واقدار کس طرح کے ہونے چاہئیں اور ساتھ ہی ہمارا دنیا کے بارے میں کون سا نظریہ اور کام جو اس دنیا کی بہتری کے لیے کام آسکتا ہے۔

یہ ایک مشکل اور گھمبیر مسائل سے بھرا ہوا سفر ہے۔ سیاست ایک ایسی وادی ہے جس کی خارزار جھڑیاں ہوتی ہیں۔ جس میں نشو ونما بہت آزاد اور دردناک ہے۔ لاطینی امریکہ کے ساتھی اس عنوان پر کام کرتے ہوئے اسے ایک منسلک اور جاری رہنے والا نظام کہتے ہیں جس میں چار سطحوں پر کام ہوتا ہے اور یہ چاروں مراحل ایک دوسرے کے ساتھ باہمی منسلک شعور ہیں۔ یہ چاروں ایسے ہیں:

۱۔ پہلا مرحلہ خاموش (مجہول) جو قدرتی طور پر صرف لینے والے ماتحت ہیں۔

۲۔ دوسرا مرحلہ سوال کرنا (پوچھنا کیوں)

۳۔ تیسرا مرحلہ تجزیہ نگاروں کو (بیان کرنا اور مظلوم حالات کو جانچنا)

۴۔ آخری سرگرم تنقیدی شعور (تنقیدی جائزہ غیر مناسب طریقے اور حالات کا دوسروں کے ساتھ مل کر اس کی تبدیلی کے کام کرنا۔)

معاشرتی انصاف کے ایک داعی کہتے ہیں:

"سیاسی شعور اور سمجھداری ایک آلہ اور مقصد ہے۔ ایک آلے کے طور پر سیاسی شعور ہمیں تنقیدی جانچ پڑتال کے ساتھ طاقت کو وسعت کے ساتھ ابھارتا ہے۔ ایک مقصد کے طور پر سیاسی شعور ہمیں ایک بنیاد فراہم کرتا ہے۔ مستحکم اور باشعور شہری کی حیثیت سے جو طاقت کے استعمال کے لیے ضروری ہے۔ سیاسی شعور یا بیداری ہمارے بہت سے اوہام کو ختم کرنے کے لیے مدد کرتی ہے جو محکومی اور تفرقات کی وجہ سے ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ انفرادی طاقت دوسروں کے ساتھ تعلق اور تمام مسائل کو پہچان سکیں۔"(۱۸)

برازیل کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص پال فرائر کے مطابق سیاسی شعور سے مراد یہ ہے کہ:

"طاقت کے تعلقات کو سمجھنا ہے۔"(۱۹)

سیاسی شعور میں نہ صرف یہ ہے کہ کسی حلقے علاقے یا کسی بھی گروہ پر اپنا رعب ودبدبہ قائم کرنا ہے۔ بلکہ وقت کے تقاضوں کے مطابق ایسی تبدیلیاں لانا ہے جو انسانی زندگی کی ضروریات اور بہتر طرز معاشرت کے لیے مفید ہو۔ اس خلاء کو پر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپس میں باہمی اتحاد واتفاق ہو۔ جو

مختلف رنگ نسل، تہذیب وثقافت اور مذہبی منفرت کی وجہ سے پائے جاتے ہیں۔ تجزیے کے بعد طاقت کے بارے میں جو لوگ منفی رائے رکھتے ہیں۔ وہ رائے واضح ہوتی ہے کہ ایک ایسا راستہ جو طاقت کی حقیقی سمجھ بوجھ مہیا کرتا ہے۔ وہ طاقت جو لوگوں کی صلاحیت ہو اور ان کی زندگی میں مثبت تبدیلیاں لائے جس کی وجہ سے لوگوں کے اندر خوشحالی آئے۔ اور معاشرے میں بھی مثبت تبدیلی لائے۔ اصل طاقت ایک شخص کی انفرادی طاقت، امید خود آشنائی ہے۔ معاشرے میں موجود تمام لوگوں کا احترام کرنا اور انسانی عزت و عظمت اور وقار کو بلند کرنا ہے۔ شعوری عمل کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں اپنے حقوق کو سمجھنے کی صلاحیت بڑھانا اور حقوق پر عمل کرانے کی جستجو اور جدوجہد ہوتا ہے۔ جو کئی صدیوں سے عزت، وعظمت اور معاشی انصاف کو معاشرے کا حصہ بنانے کی کوشش میں تھے اور یوں قومی اور بین الاقوامی آئین رائج پذیر (متعارف) ہونے کی وجہ سے اب سماج، ریاست اور معاہدات اب لوگوں کی اجتماعی زندگی کو بہتر بنانے کی خاطر اقدامات اٹھا رہے ہیں۔ ان حقوق کو حقیقت پسند بنانے کے لیے لوگوں کو یہ بتانا ضروری ہوتا ہے کہ وہ ایسی طاقت کو چیلنج کریں جو ان حقوق کی اہمیت کو تسلیم نہ کرتے ہو۔

یہاں بنیادی طور پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ سیاسی شعور کو کیسے بیدار ہوتا ہے۔

سیاسی شعور بنیادی طور پر صلاحیت واہمیت کا وہ مجموعہ ہوتا ہے جو لوگوں کو اپنے حقوق کی خاطر جدوجہد کرنے کی خاطر گامزن کرتا ہے اور اپنے حقوق کو فہم وفراست اور تدبر حکمت سے حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس میں عوامی ترجمانی بھی شامل ہوتی ہے۔

"Paulo Freire" نے اس بارے میں کہا ہے کہ:

> "یہ ایک مشترکہ کام ہے جس میں عمل، سوچ اور پھر عمل کا طریقہ کار ہے۔ اس میں مسائل کو سمجھنا، جانچنا، گفت وشنید، خود آگہی اور منظم کرنا شامل ہے۔"[۲۰]

سیاسی شعور سے مراد اصل میں یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی کسی قوم یا علاقے (یا پھر ریاست کے معاملات کو سمجھنا) اور ان معاملات کو حل کرنے کی خاطر تجاویز فراہم کرنا بھی ہے۔ ان معاملات میں دلچسپی لینے والے لوگوں کو سیاستدان کہا جاتا ہے۔

## ب: شیخ رشید احمد کی آپ بیتی "فرزند پاکستان" میں سیاسی شعور:

شیخ رشید احمد پاکستان کے شہر راولپنڈی کی ایک معروف سیاسی شخصیت ہیں ۔ وہ اپنی بے باک سیاست اور عوامی مقبولیت کے اونچے درجے پر فائز ہیں۔ لوگوں کی خدمت کا جذبہ اوائل عمر سے ہی ان کے اندر موجود ہے۔ خدمت کے اسی جذبے کے تحت انھوں نے سیاست کی وادی خارزار میں قدم رکھا۔

"فرزند پاکستان" ان کی داستان حیات ہے جس میں انھوں نے پاکستان کی سیاست کے کئی پہلو بے نقاب کیے ہیں۔ ظاہر ہے سیاست اور زندگی کے دیگر معاملات میں ہر ایک شخص کا نقطہ نظر الگ ہوتا ہے۔

"فرزند پاکستان" ان کی ایسی سیاسی، خودنوشت ہے جس میں انھوں نے اپنے تجربے اور مشاہدے کے مطابق واقعات اور شخصیات کے مرقعے پیش کیے ہیں۔ آپ بیتی کو مد نظر رکھتے ہوئے شیخ رشید احمد کے سیاسی سفر نامے میں حالات وواقعات کو پیش کیا جائے گا۔ جس انداز اور فہم وفراست سے انھوں نے ۱۹۶۵ء کے صدارتی انتخابات میں لوگوں کی آرزوں سمجھتے ہوئے فوجی آمر جنرل محمد ایوب خان کے مقابلے محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دیا یہ ایسے انتخابات تھے جس میں عوامی دباؤ کے پیش نظر جنرل ایوب نے انتخابات تو منعقد کروائے مگر اپنی جیت کو دھونس اور دھاندلی کے ذریعے یقینی بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ یہ دباؤ اس قدر پر اثر تھا کہ محترمہ فاطمہ جناح کے علاوہ کوئی بھی شخص ان کے دباؤ کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

ڈاکٹر مبارک علی کے مطابق:

> "جب فیلڈ مارشل لاء جنرل ایوب خان عالمی دباؤ کے تحت پاکستان میں ایک جھوٹی جمہوریت بحال کرنے کی خاطر بدنام زمانہ بنیادی جمہوریت کے انتخاب کے ذریعے ملک میں صدارتی انتخاب لڑنے کا اعلان کیا تو جنرل ایوب کا مقابلہ کرنے کے لیے قائد اعظم کی بہن مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کو میدان سیاست میں لانا پڑا تھا۔ اس لیے مسلم لیگ کا کوئی لیڈر جنرل ایوب کے خلاف صدارتی انتخابات میں کھڑا ہونے کی جرات اور ہمت نہیں رکھتا تھا۔"[۲۱]

شیخ رشید احمد اگرچہ اس وقت لڑکپن کے دور میں تھے مگر اپنی ذہانت کی وجہ سے عوامی جذبات اور محترمہ فاطمہ جناح کے لیے موجود ہمدردی کے جذبات کو بخوبی سمجھتے تھے اور فاطمہ جناح کی انتخابی مہم بھرپور انداز سے چلائی۔

۱۹۶۵ء میں بھارت جنگ میں جب پاکستان نے قلیل وسائل اور بے پناہ جذبہ شہادت وجرات کی بدولت بھارت پر فیصلہ کن برتری حاصل کرلی تو پوری دنیا نے پاکستان کی افواج کی بہادری اور بروقت فیصلوں کو کھلے دل سے سراہا۔ تاہم روس کے دباؤ کے تحت معاہدہ تاشقند کے ذریعے پاکستان نے جنگ میں جیتی ہوئی بازی مذاکرات کی میز پر ہار میں بدل لی۔ جس کا عوامی سطح پر سخت ردعمل سامنے آیا۔ کیونکہ جنگ کے جیتنے میں فوج کے ساتھ ساتھ عوامی جذبہ بے پناہ تھا جو کچھ عرصہ قبل ہی انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کے سبب آگ اور خون کا دریا عبور کر کے پاکستان آئے تھے۔ اس لیے انہیں یہ وطن یہ خطہ زمین جس میں ہندوؤں اکثریت کے اندیشوں سے قطعہ نظر نہایت پر سکون زندگی بسر کر رہے تھے۔ صدر محمد ایوب خان کے معاہدہ تاشقند میں اخلاقی اور مادی جیت کے باوجود بدترین شرائط پر معاہدہ سمجھ سے بالاتر تھا۔

ریاض احمد کے مطابق:

”جو کچھ میدان جنگ میں جیتا مذاکرات کی میز پر ہرا دیا گیا۔۔۔ اس معاملے پر ایوب خان کے دستخط کے ساتھ گویا ان کے زوال کی پہلی اینٹ رکھی گئی۔“[۲۲]

عوامی جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے شیخ رشید احمد نے کم عمری اور مارشل لاء کے سخت قوانین کے باوجود کالج کے لڑکوں کے ساتھ مل کر ایک جلوس میں شرکت کی۔ اس معاہدے کے تناظر میں (تاشقند معاہدہ) کے خلاف شیخ رشید اپنے احساسات کو یوں بیان کرتے ہیں:

اس روز کالج کے لڑکوں نے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا اور میں نعرے لگا رہا تھا اعلان تاشقند مردہ باد ہندوستان کا جو یار ہے غدار ہے غدار ہے کشمیر کا سودا نامنظور۔“[۲۳]

یہ واقعہ ایسا واقعہ تھا جس نے ان کے سیاسی جذبوں کو مزید مہمیز بخشی اور کالج کے طلباء سے ان کے روابط میں اضافہ ہوا۔ سکول کے زمانے ہی میں طلباء سیاست میں سرگرم رہنے والے وہ چند ہی سیاسی شخصیات

میں شمار ہوتے ہیں اس دوران جب وہ راولپنڈی پولی ٹیکنیکل کالج میں داخل ہوئے تو یہ کالج ان کی سیاسی سرگرمیوں کے لیے اچھا ثابت نہ ہوا کیونکہ بقول ان کے سیاسی سرگرمیوں سے گریزاں کالج کا ماحول ان کی غیر مطمئن اور بے چین طبیعت مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ کم و بیش دو برس بعد شیخ رشید نے گارڈن کالج میں داخلہ لیا اور اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر طلباء سیاست میں نام پیدا کیا۔ یہ دور ایسا تھا جس میں راولپنڈی میں موجود سیاسی شخصیات سے وابستہ طلباء زیادہ مقبول تھے۔ بالخصوص پیپلز پارٹی سے لوگوں کی سیاسی وابستگی دیوانگی کی حد تک زیادہ تھی۔ ایسے میں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف تحریک چلانا اور یہ بات کرنا بھی آسان نہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ کے بعد بھٹو جیسے مقبول لیڈر کے خلاف جلسے جلسوں میں شرکت کرنا اور تقریریں کرنا بہت مہنگا پڑ سکتا تھا اور اسی وجہ سے بھٹو مخالف حلقوں میں شیخ رشید احمد کی اس جرات کو پورے زور وشور سے سراہا گیا۔

پاکستان کے قیام کے صرف ایک عشرے بعد ہی پاکستان کا دولخت ہو جانا عوام کے لیے کسی بھی طرح قابل قبول نہ تھا۔ بھٹو مخالف حلقوں میں یہ بات پورے زور وشور سے کی جاتی ہے کہ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش میں بلانے میں بھٹو کی بنگال مخالف تقریروں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ ایسے میں جب عوامی لیگ کو مشرقی پاکستان میں مقبولیت حاصل تھی تو مغربی پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کو ان کی رائے کا خیال کرتے ہوئے افہام و تفہیم سے کام لینا چاہیے تھا۔

شیخ رشید احمد کی بھٹو مخالفت تحریکوں میں شرکت یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ وہ مقبول تحریکوں کے پیچھے چلنے کی بجائے اپنی ایک سوچ اور رائے رکھتے ہیں اور اسی کے مطابق چلنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

۱۹۷۷ء میں جب انتخابات کے انعقاد کا اعلان ہوا تو وہ صوبائی اسمبلی کے رکن کے لیے تحریک استقلال کی جانب سے ٹکٹ کے خواہش مند تھے۔ مگر وہ اس کے حصول میں کامیاب نہ ہوئے۔ اپنی اس ناکامی کے باوجود انھوں نے سیاسی جدوجہد کو جاری رکھا اور گجرات میں چوہدری ظہور الٰہی کی انتخابی مہم میں بھرپور حصہ لیا۔ یہ اقدام اتنا بھرپور تھا کہ گجرات میں ان کے خلاف ایک سیاسی مقدمہ بھی قائم ہوا۔ ملکی

اپوزیشن کی جماعتوں نے اس الیکشن کو دھاندلی زدہ قرار دیا۔ صوبائی الیکشن کے بائیکاٹ کی مہم اس قدر زور دار تھی کہ اس کا نوٹس لیتے ہوئے اس کی آڑ میں جنرل ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کو وزارت عظمیٰ سے معزول کرتے ہوئے ملکی اقتدار زمام اپنے ہاتھ میں لے لی اور نوے دن کے اندر دوبارہ انتخابات کرانے کا وعدہ کیا۔

اس وعدے پر ملک میں موجود اپوزیشن جماعتوں نے جنرل ضیاء الحق کا ساتھ دیا مگر جنرل ضیاء الحق نوے دنوں میں انتخابات کے دوبارہ انعقاد کے اپنے وعدے کی پاسداری نہ کر سکے۔ مارشل لاء کے دوبارہ آنے کی وجہ سے ملکی ادارے جو ابھی سیاسی نظام سے ہم آہنگ ہونے کا سوچ ہی رہے تھے ایک دفعہ پھر ڈکٹیٹر شپ کے تابع فرمان ہو گئے۔

ڈاکٹر صفدر محمود کے مطابق:

"۱۹۷۷ء میں مارشل لاء نے قوم کی ساری آئینی جدوجہد کی نفی کر دی اور ملک ایک بار پھر آئین ہو کر لاقانونیت کے اندھیرے میں ڈوب گیا۔"[۲۴]

راولپنڈی کی مشہور دینی شخصیت جو سیاسی اثر ورسوخ کے بھی حامل تھی مولانا غلام اللہ خان کو ایک دفعہ مارشل لاء کے ابتدائی دنوں میں جنرل ضیاء الحق سے ملوایا گیا اور شیخ رشید احمد ان کے ساتھ گاڑی پر گئے۔ لیکن ملاقات کے دوران باہر رہے۔ مولانا جب ملاقات سے فارغ ہو کر واپس گاڑی میں آئے تو واپسی پر ان کا تبصرہ یہ تھا کہ جنرل ضیاء الحق کسی بھی طرح اقتدار سے الگ ہونے کے لیے تیار نہیں ہے۔ ان کا تبصرہ اس قدر برجستہ خوبصورت اور برمحل تھا کہ یہ بات شیخ رشید احمد کے دل میں گھر کر گئی۔ اس واقعے کے تناظر میں شیخ رشید احمد لکھتے ہیں کہ:

"مولانا ایک گھنٹے بعد واپس آئے اور آتے ساتھ مجھے کہا کہ گاڑی تیز چلاؤ کیونکہ اس گاڑی میں میرے اور ان کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔۔۔ تھوڑی دیر بعد بولے اب الیکشن وغیرہ بھول جاؤ۔ اس آدمی کے ذہن میں ایسی بات گھسی ہوئی ہے کہ اقتدار کی کرسی پر گولی کھائے گا اور اقتدار نہیں چھوڑے گا۔ مزید کہا کہ ہم سے کوئی مسجد کی امامت نہیں لے سکتا اور سیاست دان اس سے صدارت کی کرسی کیسے لیں گے۔"[۲۵]

شیخ رشید احمد کہتے ہیں کہ مولانا کی یہ پیشین گوئی درست ثابت ہوئی اور جنرل ضیا الحق کا دور اقتدار طول پکڑتا چلا گیا۔ عام انتخابات سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے جنرل ضیا الحق نے بلدیاتی انتخابات کے انعقاد کو ممکن بنایا۔ شیخ رشید احمد نے اسی دوران اپنی سیاسی سمجھ بوجھ کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان بلدیاتی انتخابات میں حصہ لیا اور کامیاب ہوئے۔ اپنی مقبولیت کی جانچ اور سیاست میں مزید فتوحات کے حصول کے لیے انھوں نے مزید تگ و دو کی اور ڈپٹی میئر کے لیے بھی کاغذات جمع کروائے مگر وہ اس انتخاب میں کامیاب نہ ہوئے۔ اس کے بعد ان کی توجہ شہر کے مسائل اور شہر سے ممبر اسمبلی منتخب ہونے کی طرف مبذول ہو گئی۔

۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں کامیابی نے انہیں قومی اسمبلی کا راستہ دکھایا۔ یہ ان کی پہلی بڑی کامیابی تھی اور اس قدر پُر اثر تھی کہ اس کامیابی نے انہیں سیاسی داؤ پیچ سکھانے اور اسمبلی کے فلور پر اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کے قابل بنا دیا۔ حکومت میں شامل ہونے کی بجائے انھوں نے اپوزیشن کو ترجیح دی۔ اپوزیشن کے آزاد پارلیمانی گروپ کے فعال رکن تھے۔ شیخ رشید احمد اور اس گروپ کے سربراہ فخر امام تھے۔ اپوزیشن کی طرف سے سپیکر کا انتخاب فخر امام نے لڑا اور حکومتی امیدوار خواجہ صفدر کے مدمقابل اور فخر امام کامیاب ہوئے۔

بعد ازاں آزاد پارلیمانی گروپ کی طرف شیخ رشید احمد کو سیکریٹری اپوزیشن لیڈر قومی اسمبلی بنایا گیا۔ اس اسمبلی میں شیخ رشید احمد کی کارکردگی نمایاں رہی اور اس میں انھوں نے غریب عوام اور جمہوریت کی بھرپور ترجمانی کی۔

۱۹۸۵ء کے انتخابات کے نتیجے میں قائم ہونے والی اسمبلی میں وزیر اعظم محمد خان جونیجو تھے غیر جماعتی الیکشن کی وجہ سے کوئی فعال سیاسی شخصیات اس اسمبلی میں شامل نہیں تھے۔ اگرچہ شیخ رشید احمد پہلی دفعہ قومی اسمبلی کے ممبر بنے تھے مگر انھوں نے اسمبلی کے اندر ایک مدبر اور منجھے ہوئے سیاست دان ہونے کا ثبوت دیا۔ اسمبلی کے فلور کے اندر عوامی ترجمانی اپنی تقریروں سے موثر انداز میں کی۔ قومی اسمبلی میں ان کی تقریر اتنی پر اثر تھی کہ اس وقت کے وزیر اعظم محمد خان جونیجو نے بھی ان کی تعریف کی اور شیخ رشید احمد نے عوامی ترجمانی کرتے ہوئے سب کو حیران کر دیا۔

شیخ رشید احمد اپنی تقریر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''میری تقریر سے محمد خان جونیجو کے کان کھڑے ہو گئے۔ صرف محمد خان جونیجو ہی نہیں بلکہ دور تک میری اسمبلی کی تقریر کی گونج سنی جا رہی تھی۔''(۲۶)

اگرچہ ان دنوں شیخ رشید احمد اپوزیشن میں تھے۔ مگر اس کے باوجود حقیقت میں شیخ رشید احمد حکومت کے اندر رہتے ہوئے بھی اپوزیشن کا کردار بخوبی انجام دینے کا ہنر اور سلیقہ سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے انہیں بجٹ تقریر میں حکومت کے بحٹ سے متعلق کمزور پہلوؤں کو نمایاں کرنے میں اہم کامیابی حاصل کی۔ بجٹ تقریر میں عوامی ترجمانی اور عوامی مسائل پر نشاندہی کرنے کی وجہ سے ان کی اس تقریر کو حکومتی اور اپوزیشن دونوں گروپوں میں سراہا گیا اور اس وقت کے وزیر اعظم محمد خان جونیجو نے بھی ان کی تقریر میں کی گئی عوامی مسائل کی نشاندہی کا خیر مقدم کیا۔

عوامی جذبات کی ترجمانی موثر انداز میں کرنے کی وجہ سے ان کا نام اقوام متحدہ میں شرکت کرنے والے وفد میں شامل کیا گیا اور وہاں پاکستان کے وفد کی طرف ان کو تقریر کرنے کا موقع ملا اقوام متحدہ میں۔ پاکستان کی طرف سے اپنے پر وقار انداز گفتگو اور فن خطابت میں انفرادیت کے بحث شیخ رشید احمد بین الاقوامی سطح پر متعارف ہو گئے۔

بین الاقوامی سیاست میں روشناس ہونے کے باوجود ان کا دل بلدیاتی سیاست بالخصوص راولپنڈی کی میئر شپ کے لیے بے تاب رہتا تھا۔ مگر اس کے باوجود کہ بین الاقوامی سیاست میں روشناس ہو چکے تھے مگر مسلم لیگ میں شامل ہونے کے باوجود میئر شپ کا ٹکٹ حاصل نہ کر سکے۔ حالانکہ اس وقت کے وزیر اعظم محمد خان جونیجو نے انہیں میئر کے ٹکٹ کی یقین دہانی کرائی مگر اس وقت کے وزیر اعلیٰ پنجاب میاں محمد نواز شریف کی مخالفت اور علاقائی سیاست کے مقامی جوڑ توڑ اور دوسرے عوامل کی وجہ میئر شپ کا ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

وزیر اعظم محمد خان جونیجو ایک سیدھے سادھے اور شریف النفس انسان تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی اور انتظامی معاملات پر گرفت کمزور تھی۔ شیخ رشید کے مطابق اور بالآخر انہی کمزوریوں کے سبب ۱۹۸۸ میں (اوجڑی کیمپ) میں لگنے والی آگ کے بعد تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ پر انہیں وزارت عظمیٰ سے برخواست کر دیا گیا۔

شیخ رشید احمد نے انہیں عوامی رابطہ مہم کو تیز کرنے اور راولپنڈی میں جلسہ کرنے پر آمادہ کیا۔ جس کے انتظامات کی ذمہ داری شیخ رشید احمد نے اپنے سر لے لی۔ ان پر بیرونی دباؤ بہت زیادہ تھا مگر اس کے باوجود وہ اصولی بنیادوں پر محمد خان جونیجو کا ساتھ دینے پر مُصر تھے۔

شیخ رشید احمد کے اس اقدام سے ان کی اصولی سیاست کی طرفداری ملتی ہے۔

محمد خان جونیجو کی وزارت عظمیٰ سے برطرف کرنے کے بعد اقتدار کی طوالت میں اضافے کے لیے جنرل ضیاء الحق نے شریعت بل کی منظوری دی جس پر سیاسی جماعتوں اور مذہبی جماعتوں کی جانب سے شدید رد عمل دیا گیا اور الیکشن کے انعقاد کا مطالبہ زور پکڑتا چلا گیا۔

مجاہد حسین جنرل ضیاء الحق کے انتخابات کو التوا میں ڈالنے کے حربوں کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

> ”جنرل ضیا الحق وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انتخاب کو معرض التواء میں ڈالنے کی کوشش کرتے رہے لیکن ان پر ہر طرح کا سیاسی اور عوامی دباؤ بڑھ رہا تھا جس سے مجبور ہو کر انھوں نے نومبر میں انتخاب کرانے کا اعلان کیا اور کہا انتخاب غیر جماعتی ہوں گے۔“(۲۷)

اور نومبر میں ضیا الحق نے غیر جماعتی الیکشن کرانے کا اعلان تو کیا لیکن اس پر بھی تمام جماعتوں کا اختلاف تھا اور وہ جماعتی بنیادوں پر الیکشن کا انعقاد چاہتی تھیں اس حتمی فیصلے سے قبل۔

اگست ۱۹۸۸ء میں جنرل ضیاء الحق کے حادثے میں انتقال کے بعد نو منتخب صدر غلام اسحاق خان نے جماعتی الیکشن کرانے کا اعلان کیا اور اس دوران اسلامی جمہوری اتحاد کے تحت شیخ رشید احمد نے ۱۹۸۸ء میں ہونے والے انتخابات میں کامیابی حاصل کی۔ اگرچہ خالص فوجی پس منظر اور مقبول ترین سیاسی جماعت پیپلز پارٹی کے امیدوار جنرل ٹکا خان سے انتخابات میں کامیابی حاصل کرنا آسان بات نہ تھی۔ مگر اس کے باوجود شیخ رشید احمد اپنی عوامی مقبولیت کی وجہ سے کامیاب ہوئے اور وہ کامیابی کے بعد ملک معراج خالد کے مد مقابل سپیکر کے الیکشن کے لیے (آئی جے آئی) کے متفقہ امیدوار تھے مگر ۷۲ ووٹ لے کر سپیکر کا انتخاب جیتنے میں ناکام رہے۔

۱۹۸۸ء کی اسمبلی میں حزب اختلاف کی پارٹیوں کا ایک فعال رکن ہونے کے طور پر شیخ رشید احمد نے اپنی نمائندگی کا حق ادا کیا۔ ان کی جملہ بازی مخالفین کے لیے ایک زبردست حملے کی حیثیت رکھتی تھی۔ جس کے زد میں آنے والے کسی شخص کو جائے امان میسر نہ تھی مگر جملہ بازی کے باوجود شیخ رشید نے تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ شیخ رشید نے اپنی کتاب میں ان عرفیتوں القابات کا ذکر کیا ہے جس نے ملک گیر شہرت حاصل کی۔

وفاقی حکومت پر زبردست تنقید اور تابڑ توڑ حملوں کی وجہ سے وفاقی حکومت نے ان کی نقل و حرکت پر کڑی نگاہ رکھی اور ان کی ٹیلی فون اور آمد و رفعت کے اوقات میں ان کی نقل و حرکت کو دیکھا جانے لگا۔ بے نظیر کے خلاف چلنے والی عدم اعتماد کی تحریک میں اپنی سیاسی دانست کے مطابق صف اول میں شامل رہے۔ یہ تحریک تو کامیاب نہ ہو سکی مگر اس نے حکومت کی ساکھ کو نقصان پہنچایا اور بالآخر صدر غلام اسحاق نے کرپشن کی وجوہات کی بنا پر اسمبلیاں تحلیل کر دیں۔ مجاہد حسین پیپلز پارٹی کی حکومت کے دوران سیاسی وفاداریوں کی کھلے بندوں خرید و فروخت اور ملکی وسائل کی لوٹ کھسوٹ کے شرم ناک واقعات سے متعلق اپنی تصنیف میں تحریر کرتے ہیں:

> ”بے نظیر حکومت پر سیاسی وفاداریوں کی کھلے بندوں لگاتار خرید وفروخت کے ذریعے انتخابی مینڈیٹ میں خرد برد آئین کی خلاف ورزی انتہائی وسیع پیمانے پر قومی وسائل کی لوٹ کھسوٹ اور بدعنوانیوں کی شرمناک وارداتوں اور کرپشن جیسے سنگین الزامات عائد کیے گئے۔“(۲۸)

ان وجوہات کی بنا پر صدر غلام اسحاق نے اسمبلیاں تحلیل کر کے نگران حکومت قائم کر دی اور ۱۹۹۰ء میں منعقدہ انتخابات میں پیپلز پارٹی کے امیدوار چودھری مشتاق حسین کے مقابلے میں ایک دفعہ پھر شیخ رشید احمد نے کامیابی حاصل کی۔ مرکز اور پنجاب میں اسلامی جمہوری اتحاد نے حکومت قائم کی اور میاں نواز شریف پہلی دفعہ وزارت عظمی کے منصب پر فائز ہوئے۔ شیخ رشید احمد اس دفعہ عوامی مقبولیت کی بناء پر زیادہ نکھر کر سامنے آئے اور نواز شریف سے قریبی تعلق ہونے کی بنیاد پر اس پر انہیں وزارت اطلاعات کا مشیر بنایا گیا۔ بعد میں انہیں وفاقی وزیر کا درجہ دیا گیا۔ کشمیری نثراد ہونے کی بنا پر نوے کی دہائی میں سرگرم کشمیر کی تحریک آزادی کے لیے انھوں نے سب سے زیادہ کام کیا۔ ان کے اس اقدام کی کشمیر کے لوگوں میں بھرپور حمایت کی گئی۔

اپنی آواز اور اپنے دلی جذبات سے مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے سرحدی علاقوں میں نصب ریڈیو اور ٹی وی کے بوسٹر اور انٹینوں کو مرمت کیا گیا۔ لیکن انہیں توقع کے مطابق مالی معاونت حاصل نہ ہو سکی۔

اسی حوالے سے شیخ رشید احمد لکھتے ہیں:

> ”میں نے وزارت میں آنے کے بعد کوشش کی کہ وادی کشمیر میں پاکستان کی خبروں کو دیکھا جا سکے جو انٹینے سرحدوں پر خراب تھے ان کو خود ٹھیک کروایا۔۔۔ لیکن میری بدقسمتی یہ تھی کہ حکومت کی پالیسیوں کے مطابق میں وہ مدد اخبار سے نہ لے سکا جس کی مجھے توقع تھی۔“(۲۹)

وزارت اطلاعات شیخ رشید احمد کی سیاسی تربیت کے لیے اس لیے بھی اچھی ثابت ہوئی کہ اس میں انہیں تمام جماعتوں کے کمزور اور طاقت ور پہلوؤں کے بارے میں علم ہوا، انہی خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر انھوں نے اس وزارت میں کامیابی کے جھنڈے گاڑھے۔ وزارت اطلاعات کو چھوڑنے کے بعد وزارت صنعت و کلچر کی ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی۔ جس میں شیخ رشید احمد نے غیر ملکی سرمایہ کاروں کی حوصلہ افزائی اور اس میں اضافے کے لیے چھ غیر ملکی کانفرنسوں کا انعقاد ممکن بنایا۔ یہ کوششیں اتنی اہم اور بروقت تھی کہ اس کے پیش نظر نواز شریف کے انتہائی قریب رفقاکار میں ان کی اہمیت مسلم تھی۔

اپنی وزارت کی بہتر کارکردگی کی وجہ سے شیخ رشید احمد نواز شریف کے پسندیدہ وزراء میں شمار ہوتے تھے اور اسی وجہ سے خلیجی ممالک کے دوروں کے دوران وہ انہیں ساتھ لے گئے تاکہ ان کے مفید مشوروں سے کام لیا جاسکے۔

نواز شریف کے دور اول کے کابینہ سے متعلق شیخ رشید احمد یوں بیان کرتے ہیں:

> ”نواز شریف کی وزارت عظمیٰ کے دوران چار قسم کی کابینہ تھی۔ ایک ساتھ رکنی ایک نو رکنی اور گیارہ رکنی اور ایک کابینہ وہ تھی جو ٹی وی کے کیمرے میں پیش کی جاتی تھی۔ سات رکنی کابینہ میں شیخ رشید احمد، چودھری نثار، چودھری شجاعت، سردار مہتاب عباسی اور ملک نسیم، جنرل حمید ملک اور نواز شریف ہوتے تھے۔ ۹ رکنی میں اعظم ہوتی اور اعجاز الحق کا اضافہ کیا جاتا تھا اور گیارہ رکنی میں کانجو اور لالیکا بھی شریک ہوتے لیکن تمام میٹنگز میں شہباز شریف کا ہونا لازمی امر تھا۔“[۳۰]

شیخ رشید احمد اپنی وزارت کو بہتر طریقے سے چلانے کی وجہ سے نواز شریف کو بہت پسند تھے اور نواز شریف ان کی بہتر سیاسی سوچ کا اعتراف کرتے تھے۔ اس وقت صدر غلام اسحاق خان وزیر اعظم نواز شریف اور فوج کے درمیان فاصلے برقرار تھے۔ اس دور میں بیرون ممالک سفیروں کی کارکردگی بھی تسلی بخش نہ تھی۔ حتیٰ کہ وزیر اعظم نواز شریف ان معاملات سے بھی آگاہ نہ کیا گیا جو جنرل اسلم بیگ نے ایران میں رفسجانی سے طے کیے تھے۔

اس وقت صدر غلام اسحاق خان اور نواز شریف کے درمیان خلیج میں اضافہ ہو گیا اور نواز شریف بھی اس معاملے میں سوچ وبچار میں تھے کہ آٹھویں آئینی ترمیم کو ختم کر دیا جائے لیکن اس سے قبل صدر غلام اسحاق خان نے آئین کی آٹھویں ترمیم (۵۸۔۲b) کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وزیر اعظم نواز شریف کو برطرف کر دیا۔ آئین میں آٹھویں ترمیم ضیاالحق نے کی تھی جس کا بنیادی مقصد پارلیمان کو کمزور کرنے اور وزیر اعظم کے اختیارات کم کر کے صدر کے اختیار بڑھانا اور اسمبلی تحلیل کرنے کا اختیار صدر کے پاس ہونا تھا۔ صدر غلام اسحاق خان کے اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں پٹیشن دائر کی گئی اور میاں نواز شریف کی حکومت کو بحال کر دیا تو اس سارے سیاسی کھچاؤ میں شیخ رشید احمد نے میاں نواز شریف کا ساتھ دیا۔ کیونکہ یہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہے اور عوام میاں نواز شریف کے ساتھ تھی۔

سپریم کورٹ کی طرف سے میاں نواز شریف کی حکومت کو بحال تو کیا گیا لیکن سیاسی درجہ حرارت میں کمی نہ آسکی اور بالآخر پنجاب میں وزیر اعلیٰ پنجاب غلام حیدر وائیں کے خلاف اعتماد کی تحریک نے مسلم لیگ کے اقتدار کو سبوتاژ کر دیا گیا اور بالآخر اسمبلیاں تحلیل کر دی گئیں اور نگران حکومتیں قائم کی گئیں۔

اکتوبر ۱۹۹۳ء میں الیکشن ہوئے تو ایک بار پھر شیخ رشید احمد اپنی سیاسی جدوجہد اور داؤ پیچ کی بدولت الیکشن میں فاتح رہے۔ اگرچہ مرکز میں پیپلز پارٹی نے حکومت بنائی اور بے نظیر بھٹو دوسری مرتبہ وزارت عظمی کے منصب پر فائز ہوئیں۔ صدر مملکت سردار فاروق احمد لغاری بنے اور چند دنوں بعد وسیم سجاد چیئرمین سینٹ بنے جس کا کریڈٹ مسلم لیگ کو جاتا تھا۔

مسلم لیگ نے اپنی سیاسی جدوجہد جاری رکھنے کے لیے تحریک نجات کے نام سے پیپلز پارٹی کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کیا تو شیخ رشید احمد بھی اس تحریک کے حامیوں میں شامل تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ حکومت مخالف تحریک سے ہی لوگوں کو اپنی طرف راغب کیا جا سکتا ہے۔ اس تحریک میں شیخ رشید احمد صف اول کے رہنماؤں میں شامل رہے۔ میاں محمد نواز شریف کے ساتھ پورے ملک کے دورے کیے۔ حکومت کے خلاف جارہانہ رویہ اختیار کرنے کی وجہ سے حکومت نے شدید ردعمل اور بالآخر شیخ رشید احمد اور لال حویلی کے خلاف انتقامی کاروائی شروع کر دی۔ لیکن اس کے باوجود ان کے جذبہ استقلال میں کمی نہ آئی۔

بالآخر انہیں گرفتار کیا گیا اور انہیں اڈیالہ، جھنگ اور بہاولپور جیل میں رکھا گیا اور آخر کار انہیں ملک لطیف علی لطف کی عدالت سے کلاشنکوف جیسے جھوٹے اور خود ساختہ مقدمے میں ۷ سال قید اور ۲ لاکھ جرمانے کی سزا سنائی گئی۔ سیاسی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہر صاحب اقتدار نے اپنے سیاسی مخالفین کو دبانے کے لیے جائز اور ناجائز ہر طرح کے حربے اختیار کیے ہیں۔

اس عجیب اور خود ساختہ واقعے کو شیخ رشید احمد اپنی تصنیف فرزند پاکستان میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''برصغیر پاک وہند کا یہ دلچسپ اور انوکھا کیس تھا۔ جس میں پولیس ہی مدعی پولیس نے تفتیش کی۔ پولیس نے شہادت دی ہے اور پولیس ہی نے برآمدگی بھی کی ہے۔ اس بات کو کسی نے درست تسلیم نہیں کیا حتی کہ میرے کٹر مخالفین نے بھی مشترکہ پریس کانفرنس میں کہا۔۔۔ کلاشنکوف جھوٹے کیس میں اسے نیلسن منڈیلا نہ بنایا جائے۔ ۱۶ کروڑ کی آبادی میں کوئی سویلین شہادت حکومت کو نہ ملی۔''[۳۱]

اس تمام کام کے باوجود حکومت شیخ رشید احمد کو دبانے میں کامیاب نہ ہو سکی اور ان کی مقبولیت میں اور اضافہ ہو گیا۔ شیخ رشید احمد کی یہ داستان حیات ان کے بچپن کے حالات زندگی سے لے کر ۱۹۹۵ء میں آٹھ ماہ کی بہاولپور کی جیل میں قید وبند کی صعوبتوں پر مشتمل ہے۔ جس کو انھوں نے ''فرزند پاکستان'' کا نام دیا ہے۔ ان کی اس داستان حیات سے پاکستان کے سیاسی سماجی حالات وواقعات سے آگاہی ہوتی ہے۔

پاکستان رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے دنیا کے بڑے ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں آزادی کے ستر برس سے زائد وقت میں کئی سیاست دان آئے اور منظر عام سے غائب ہوتے چلے گئے۔ کئی سیاست دان اپنے وقت میں مقبول تھے۔ مگر گزرتے دنوں کے ساتھ نقش بر آب ثابت ہو گئے۔ لیکن بہت سارے رہنماؤں نے تاریخ میں جگہ بنالی۔ شیخ رشید احمد کا شمار ایسے ہی سیاست دانوں میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے اپنے طویل سیاسی کیریئر میں مقبول ترین سیاست دانوں کو شکست فاش سے دوچار کیا اور نہ صرف مقامی بلکہ قومی

سطح پر اپنے فیصلوں، جملہ بازیوں اور عوامی انداز کی بنا پر ابھی تک سیاسی منظر نامے پر موجود ہیں اور عوامی ترجمانی کا حق ادا کر رہے ہیں۔ غربت سے امارت اور وزارت سے جیل کی زندگی تک کے سفر میں ان کے داخلی اور سیاسی تجربات میں بے پناہ اضافہ کیا اور وہ ایک ایسے سیاسی رہنما کے طور پر سامنے آئے ہیں جن کی رائے کو رد کرنا آسان نہیں ہوتا اور ملکی معاشی اور سیاسی مسائل میں ان کی رائے کو خاصی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

## ج: عبدالمجید ملک کی آپ بیتی "ہم بھی وہاں موجود تھے" میں سیاسی شعور:

"ہم بھی وہاں موجود تھے" لیفٹیننٹ جنرل (ر) عبدالمجید ملک کی خود نوشت ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے عسکری، سفارتی اور اپنی سیاسی جدوجہد اور اپنی ذاتی کامیابیوں کے ساتھ ساتھ تقسیم برصغیر اور تقسیم کے بعد پاکستان کے اندرونی حالات وواقعات اور بیرون ممالک پاکستان تعلقات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ کتاب ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات پر مشتمل ہے۔ عبدالمجید ملک کی یہ داستان حیات ایک تاریخی دستاویزات کی حیثیت رکھتی ہے۔

عبدالمجید ملک کا تعلق موجودہ ضلع چکوال سے تھا۔ عہد شباب میں فوج میں بھرتی ہے۔ اور اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے تک جا پہنچے۔ فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد مراکش میں پاکستان کے سفیر بنے اور سفارت سے واپس آکر انھوں نے سیاست کی خار زار وادی میں قدم رکھا اور سیاسی میدان میں کامیابی ہمیشہ ان کا مقدر بنی۔ ۱۹۸۵ء سے لے ۲۰۱۳ء تک ان کی زندگی میں آٹھ جنرل الیکشن ہوئے۔ تمام الیکشنوں میں مخالفین کو شکست سے دوچار کیا۔ ۱۹۸۵ء سے لے کر ۱۹۹۷ء کے پانچ الیکشنوں میں وہ خود ایم این اے منتخب ہوئے اور اس کے بعد تین الیکشنوں میں ان کے حمایت یافتہ امیدوار کامیاب ہوئے۔ اگرچہ انھوں نے زندگی کا طویل عرصہ فوجی ملازمت میں گزارا تھا۔ مگر اس کے باوجود اپنی سیاسی حکمت عملی اور ہمیشہ بروقت سیاسی فیصلے کرنے کی وجہ سے ہمیشہ اپنے سیاسی مخالفین کو شکست سے دوچار کیا۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ فوج کو ملک کے تمام انتظام وانصرام سے مکمل آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ بالخصوص پاکستان میں پروفیسر حسن عسکری اپنی کتاب "ملٹری اینڈ پالیٹیکس" میں لکھتے ہیں کہ:

''پاکستان ایک ایسا ملک ہے جہاں فوج کو سیاسی معاملات میں ضرورت سے زیادہ تجربہ اور بالا دستی حاصل ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ طرفداری افسر شاہی ہے۔ جس میں مختلف اداروں کو چلانے کی صلاحیت موجود ہے۔ پاکستان کی سیاسی قوتیں کمزور ہیں اور فوج طاقت ور اور فیصلہ کن حیثیت کی حامل ہے۔''(۳۲)

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جب پاکستان بنا تو اس وقت فوج ہی تھی جس نے مہاجرین کے کیمپوں کو سنبھالا اور وقت پر تمام حالات وواقعات کو کنٹرول کیا۔

عبدالمجید ملک قیام پاکستان کے وقت nd(۲/۳) پنجابی (۲۷ پنجابی) رانچی اڈیان میں تھے اور انھوں نے ''فال اِن'' کیا اور مسلم لیگ کے جھنڈے کے ساتھ سفید پٹی (اپنی دانست کے مطابق) لگا کر پاکستان کا قومی پرچم لہرایا۔

تقسیم ہند کے بعد لوگوں کی منتقلی کا جو مرحلہ پیش کیا اس کو عبدالمجید ملک نے یوں بیان کیا ہے:

''مہاجرین کے قافلے خچروں، گدھوں، بیل گاڑیوں اور دوسرے باربرادر جانوروں پر سامنے لادے ہوئے خوف، بے یقینی اور تھکاوٹ کی کیفیات میں مبتلا مگر رواں دواں تھے۔ بعض کے پاس کوئی باربرادر جانور نہیں تھے۔۔۔ جالندھر اور بیاس سے چل کر امرتسر مال منڈی (Staging Camp) میں یہ قافلے ہماری نگرانی میں ایک رات قیام کرتے۔ دوسری شام تک واہگہ پہنچتے جہاں وہ پاکستان میں داخل ہو جاتے۔''(۳۳)

تقسیم ہند کے بعد آنے والے قافلوں کو ان مشکلات سے گزرنا پڑا جو ہندوستان سے پاکستان آئے تو اس سارے معاملات میں مہاجرین کی معاونت فوج نے بھرپور انداز سے کی اور اس وقت عبدالمجید ملک بھی فوج میں تھے۔ ان سارے معاملات میں فوج کی معاونت مہاجرین کو حاصل رہی جس کی بدولت پاکستان کے اندرونی معاملات میں بھی فوج کی دلچسپی بڑھ گئی۔

نوزائیدہ ملک جس کا ابھی تک انتظامی ڈھانچہ نہیں تھا اور ۱۹۳۵ء کے آل انڈین ایکٹ میں تبدیلی کر کے ملک کا عارضی نظام چلا گیا اور ۱۹۴۹ء میں بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی وفات اور اس کے دو

سال بعد ۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خان کے قتل کے بعد ملک سیاسی طور پر مستحکم نہ ہو سکا اور بالآخر گورنر جنرل نے تو ایوب خان کو وزیر دفاع مقرر کر دیا۔ کسی بھی ملک کی جمہوری حکومت میں باوردی شخص کا وزیر دفاع ہونا ایک انوکھا واقع تھا۔

۱۹۵۶ء میں ملک کو پہلا باقاعدہ آئین دیا گیا مگر بالآخر ۱۹۵۸ء میں جنرل ایوب خان اور صدر سکندر مرزا کے آپس میں صلاح مشورے کے بعد دونوں رہنماؤں کا اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ وزیر اعظم کو برطرف کر کے مارشل لاء لگا دیا جائے۔

۱۹۵۸ء میں لگنے والے ملک کے پہلے مارشل لاء کی دستاویزات کی تیاری میں جنرل عبدالمجید ملک نے کلیدی کردار ادا کیا اور رازداری سے کام لیا۔ کیونکہ سیاست کے میدان میں کامیاب ہونے کے لیے یہ امر ضروری ہوتا ہے کہ اپنے راز کو خفیہ رکھیں جب تک اپنا ہدف حاصل نہ کر لیں۔ میدان سیاست ہو یا کہ جنگ کا میدان ہو دونوں صورتوں اپنے مخالفین کو مات دینے کے لیے انتہائی راز داری سے کام لینا ضروری ہوتا ہے۔ عبدالمجید ملک اپنی اس خفیہ پلاننگ یوں بیان کی ہے:

> ''مارشل لاء کی اس ابتدائی پلاننگ میں جو جرنیل شامل تھے ان میں جنرل ایوب خان، جنرل یحییٰ، جنرل عبدالمجید، بریگیڈیئر عتیق الرحمن اور بریگیڈیئر پیرزادہ (ڈی ایم او) شامل تھے۔ میں چونکہ جونیئر آفیسر تھا اس لیے مجھے سب کا سٹاف آفیسر بنایا گیا۔ البتہ مجھے ایک سپرنٹنڈینٹ کلرک رکھنے کی اجازت تھی۔۔۔ اس آپریشن کی پلاننگ اس حد تک انتہائی خفیہ (ٹاپ سیکرٹ) تھی کہ ملٹری انٹیلی جنس بھی اس سے بے خبر رہی۔''[۳۴]

شاید ان تجربات کی بنیاد پر عبدالمجید ملک نے اپنی ذاتی سیاسی زندگی کو کامیاب بنانے کا فن سیکھا۔ مارشل لاء کی دستاویزات مکمل ہونے کے بعد اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ملک میں پہلا مارشل لاء لگایا گیا۔

مارشل لاء لگاتے وقت سکندر مرزا اور ایوب خان نے ایک ساتھ اقتدار کرنے کا سوچا تھا مگر یہ صورتحال زیادہ دیر تک نہ چل سکی اور بالآخر چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ایوب خان نے صدر سکندر مرزا کے استعفیٰ لینے کے احکامات جاری کیے اور اس استعفیٰ کی دستاویزات تیار کرنے کی ذمہ داری ایک مرتبہ پر

عبدالمجید ملک کو دی گئی اور اس کے بعد جرنیلوں کا جو وفد صدر سکندر مرزا سے استعفیٰ لینے کے لیے گیا اس میں بھی عبدالمجید ملک شامل تھے۔ اگرچہ اس وفد میں یہ جونیر آفیسر تھے۔ مگر اس واقع کے بعد ان کو اس بات سے آگاہی ہو گئی کہ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ سیاست میں کوئی چیز حرف آخر نہیں ہوتی۔ آج کے حلیف کل کے حریف اور آج کے حریف کل کے حلیف صدر سکندر مرزا اور جنرل ایوب خان نے صدر سکندر مرزا سے جبری استعفیٰ لے کر اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

جنرل ایوب خان کے اقدامات کو جمہوری اور عوامی رائے پر یقین رکھنے والے سیاستدانوں نے تنقید کا نشانہ بنایا۔ مارشل لاء کے جواز کے اعتراف جسے ایم اے چودھری نے اپنی مارشل لاء کا سیاسی انداز میں لکھا ہے۔"

> "کمزور اور ڈھمل یقین سیاسی حکومتوں نے قوم میں نظم وضبط مٹا دیا۔ سیاستدان ہمہ وقت آپس کے جھگڑوں میں مصروف رہے اور انھوں نے اپنی ہوس اقتدار کی خاطر قوم اور ملک کے مفادات کو پس پشت ڈال دیا۔"(۳۵)

جنرل ایوب خان کا یہ اقدام غیر آئینی تھا۔ لیکن اس کے پس منظر میں جمہوری قوتوں کی کمزوری کے ساتھ ساتھ جنرل ایوب خان کو ان جمہوری قوتوں کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ جیسا کہ اس پلاننگ کے ماسٹر مائنڈ خود صدر سکندر مرزا تھے۔

جنرل ایوب خان نے ۱۹۶۲ء میں ملک کو ایک نیا آئین دیا اور جسٹس شہاب الدین کی سربراہی میں دس رکنی کمیٹی نے یہ آئین تشکیل دیا تو ان سارے معاملات سے جنرل عبدالمجید ملک بھی واقف حال رہے کیونکہ ایک فوجی آمر کا دور تھا اور عبدالمجید ملک بھی فوج میں ایک اہم ذمہ داری سرانجام دے رہے تھے۔

۱۹۶۵ء میں جنرل ایوب خان نے اپنے اقتدار کو مزید طویل دینے کے لیے صدارتی انتخابات کا انعقاد کیا تو ان کے مقابلے میں محترمہ فاطمہ جناح نے انتخاب میں حصہ لیا۔ اگرچہ وہ یہ انتخاب جیت گئے۔ مگر عوامی حلقوں میں اس کا خیر مقدم نہ کیا گیا اور عوام الناس میں ایوب خان کے خلاف نفرت پھیلتی چلی گئی بالآخر جب ۱۹۶۵ء میں تاشقند کا معاہدہ ہوا تو اس وقت ذوالفقار علی بھٹو (وزیر خارجہ) کی حیثیت سے تھے تو انھوں نے عوامی ترجمانی کرتے ہوئے احتجاجاً مستعفی ہو گئے۔ جس کو عبدالمجید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"معاہدہ تاشقند ہوا تو عوامی تاثر یہ تھا کہ پاکستان نے اپنے آپ کو (Sell Out) کیا ہے۔ بھٹو نے جلتی پر تیل کا کام کیا تو اس سے صورتحال اور بھی خراب ہو گئی اور ایوب مخالف قوتیں اکٹھی ہو گئیں۔"(۳۶)

جنرل عبدالمجید ملک کی اس بات سے یہ ثبوت ہوتا ہے کہ سیاسی میدان میں کسی طاقت ور کو شکست دینے کے لیے تمام کمزور قوتیں چاہیے ان کے نظریات مختلف ہی کیوں نہ اور ان کی پارٹیاں اور پارٹی منشور بھی الگ الگ کیوں نہ ہو تو سب ایک ہو جاتے ہیں۔

بالآخر جب ۱۹۶۹ء میں ایوب مخالف قوتوں کی تحریکوں سے تنگ آکر صدر ایوب خان مستعفی ہو گئے۔ اس سے قبل ان کو پی این اے کی قیادت سے مذاکرات کرنے پڑے اور پی این اے کی پابند سلاسل رہنماؤں کو رہا کر دیا اور اقتدار سپیکر کے حوالے کرنے پر ان کا اتفاق ہوا لیکن اس کے بعد انھوں نے اپنے فیصلے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جنرل یحییٰ خان کو زمام اقتدار سونپ دیا۔

جنرل یحییٰ خان کے اقتدار کا تسلسل جنرل ایوب خان کے دور سے مشابہت رکھتا تھا اور دونوں بیک وقت صدر اور جنرل تھے۔ اگرچہ اس کے بعد ۱۹۷۰ء میں جنرل یحییٰ خان نے عام انتخابات تو کروائے۔ یہ انتخابات آزاد اور منصفانہ تھے۔ مگر شرکت اقتدار کے لیے یہ عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی میں زبردست اختلاف پیدا ہو گیا۔

جنرل عبدالمجید ملک اس غیر منصفانہ الیکشن اور پاک فوج میں مغربی پاکستان کے لوگوں کا احساس برتری کو ہی سقوط ڈھاکہ کا سبب قرار دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے دل میں احساس محرومی بڑھتا گیا۔ جنرل عبدالمجید ملک کی اس بات کی تائید کرتے ہوئے تقی الدین یوں لکھتے ہیں:

"مشرقی پاکستان کے لوگ یہ محسوس کرنے لگ گئے کہ وہ انگریز کی غلامی سے نکل کر مغربی پاکستان کی فوج میں آگئے ہیں۔ اس غلامی سے نجات حاصل کرنے کی خواہشات لوگوں کے ذہنوں میں پروان چڑھنا ہو گئیں اور اکتوبر ۱۹۵۸ء میں پاکستان پر ایک فوجی انقلاب جنرل ایوب کی زیر قیادت مسلط کر دیا گیا جس سے مشرقی پاکستان کے لوگوں میں احساس محرومی اور زیادہ گہرا کر دیا۔"(۳۷)

آخر کار ۱۹۷۱ء میں سانحہ سقوط ڈھاکہ سے پاکستان دولخت ہو گیا اور ایک حصہ جو مشرقی پاکستان تھا وہ بنگلہ دیش بن گیا اور مغربی پاکستان اب دنیا کے نقشے پر پاکستان کے نام سے موجود ہے اس موضوع پر عبدالمجید ملک نے اپنی تصنیف میں بے باکی اور صاف گوئی کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس میں وہ مغربی پاکستان کی قیادت کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔

سانحہ کے بعد ذوالفقار علی بھٹو (بانی پاکستان پیپلز پارٹی) نے اقتدار کی باگ دوڑ سنبھال کر عوامی نمائندہ ہونے کا دعوی کیا۔ جنرل عبدالمجید ملک کے مطابق جب ذوالفقار علی بھٹو نے زمام اقتدار پر قبضہ کرنے کے مطلق اس بات کا اظہار بھی کیا ہے کہ جو جنرل یحیٰی خان نے ذولفقار علی بھٹو سے کی تھی کہ انہیں صدر رہنے دیں اور آپ وزیر اعظم کا منصب سنبھالیں۔ لیکن ذوالفقار علی بھٹو نے اس بات سے انکار کیا کیونکہ اس سے بھٹو کے سیاسی فلسفے کی آبیاری ممکن نہیں تھی اور جنرل یحیٰی خان کو نظر بند کر دیا اور باقی سارا وقت نظر بندی میں گزرا اور وہاں وفات پائی۔

ذولفقار علی بھٹو کے اقتدار کو سنبھالنے کے بعد ایک دفعہ جب جنرل عبدالمجید ۱۱ ڈویژن چونکہ ہندوستانی سرزمین (حسینی والا سیکٹر) میں لاہور سے قریب تھا تو ذوالفقار علی بھٹو کو اس کا وزٹ کرایا گیا تو جنرل عبدالمجید ملک نے ذوالفقار علی بھٹو کو بریفنگ دی۔ ان کے اس وزٹ کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ رابطہ قائم ہو گیا اور ذولفقار علی بھٹو نے انہیں ایک مرتبہ چیف آف آرمی بنانے کا بھی اشارہ دیا تھا۔ لیکن یہ چیز صرف زبانی تھی اور ذوالفقار علی بھٹو جنرل عبدالمجید ملک کو چیف آف آرمی سٹاف نہ بنا سکے شاید اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ سیاست میں وقت کے مطابق فیصلے کیے جاتے ہیں۔

جب جنرل ضیاء الحق کو چیف آف آرمی سٹاف بنایا گیا تو جنرل عبدالمجید ملک نے استعفی دے دیا۔ جنرل ضیاء الحق کا بطور سنیارٹی ساتواں نمبر تھا۔ اس وقت کے آرمی سنیارٹی کے نام اس طرح ہیں:

۱۔ لیفٹیننٹ جنرل محمد شریف

۲۔ لیفٹیننٹ جنرل محمد اکبر خان

۳۔ لیفٹیننٹ جنرل آفتاب احمد خان

۴۔ لیفٹیننٹ جنرل عظمت بخش اعوان

۵۔ لیفٹیننٹ جنرل آغا ابراہیم اکرم

۶۔ لیفٹیننٹ جنرل عبدالمجید ملک

۷۔ لیفٹیننٹ جنرل محمد ضیاء الحق

اگرچہ جنرل عبدالمجید ملک کا چھٹا نمبر تھا مگر وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔

۱۹۷۶ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں عبدالمجید ملک کو مراکش میں بطور سفیر مقرر کیا گیا اور بطور سفیر انھوں نے پاکستان کی بھرپور نمائندگی کی اور پاکستان کے اندرونی حالات وواقعات سے بھی باخبر رہے ان دنوں ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں دھاندلی کے بعد جب پیپلز پارٹی مخالف تحریک چلی تو ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو ملک کو خانہ جنگی سے بچانے کا دعوی کرتے ہوئے جنرل محمد ضیاء الحق نے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا اور بھٹو حکومت تحلیل کر دی۔ اس کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کو نواب محمد احمد خان قصوری کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ ۱۸ مارچ ۱۹۷۸ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ ملک کے اندر ہونے والے اس تمام حالات وواقعات سے عبدالمجید ملک باخبر رہے اور اس کے متعلق فکر مند رہے کیونکہ بیرون ملک جب کوئی اپنے ملک کی نمائندگی کر رہا ہو تو اس پر لازمی ہوتا ہے کہ وہ اپنے ملک کے امیج کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے۔

ذوالفقار علی بھٹو کو قتل کے الزام میں جب پھانسی کا فیصلہ سنایا گیا تو عبدالمجید ملک نے مراکش سے ایک خط لکھا اس وقت کے صدر جنرل ضیا الحق کو جس میں انھوں نے پھانسی نہ دینے کا مشورہ دیا کیونکہ وہ عالمی حالات وواقعات کے مطابق معاملات کو افہام وتفہیم سے طے کرنا بہتر سمجھتے تھے۔ پھر جب ذوالقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی تو انھوں نے وطن واپس آنے کو مناسب سمجھا جس کو عبدالمجید ملک نے یوں بیان کیا ہے:

''میری سفارت کے دو سال ۱۹۷۸ء میں پورے ہوئے۔ مجھ سے فارن آفس نے رابطہ کیا کہ آپ اگر چاہیں تو آپ کو ایک سال توسیع دی جاسکتی ہے مگر بھٹو کی پھانسی کے بعد عالمی طور پر پاکستان کا جو تصور بن گیا تھا اس کے باعث میرے خیال میں سفارت کاری بدمزہ ہو گئی تھی اس لیے میں نے توسیع لینے سے انکار کر دیا اور بھٹو کی پھانسی کے بعد ۱۹۷۹ء میں اپنا سفارتی عہدہ چھوڑ کر فیملی سمیت پاکستان واپس آ گیا۔''[۳۸]

عسکری اور سفارتی معاملات میں وسیع تجربہ اور کامیابیوں کے بعد بالآخر انھوں نے سیاست کے عملی میدان میں قدم رکھا اور ان کا سیاست میں آنے کا مقصد صرف علاقے کی تعمیر وترقی تھا اور چکوال کے دور افتادہ علاقوں میں پسماندگی کا خاتمہ اور وہاں کے لوگوں کو ان کے بنیادی حقوق کی فراہمی کرنا تھا۔

عبدالمجید ملک نے اپنے سیاست میں آنے کے مقصد کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے جس کو صفدر شاہد نے اپنی کتاب دھن میں بیان ہے۔

''سیاست میں آنے کا رجحان نہ پہلے تھا نہ اب ہے اور نہ میں کوئی روایتی سیاست دان ہوں، بہر حال چونکہ میں ایک بڑے دور افتادہ اور پسماندہ علاقہ دیہات میں پیدا ہوا۔ وہیں بڑا ہوا اور اسی وجہ سے دوران ملازمت اور اس کے بعد اپنے علاقے کی عوام کی فلاح وبہبود کے لیے کوئی نہ کوئی رفاعی کام کرتا رہا اور اس رفاعی کام کو جاری رکھنے کے لیے سیاست میں قدم رکھا۔''[۳۹]

ان کی اس بات سے یہ معلوم ہوا کہ وہ کوئی روایتی سیاست دان یا ان کا مقصد اقتدار نہیں تھا بلکہ عوامی خدمت کا جذبہ کارفرما تھا۔ چکوال کے عوامی گروپ میں شمولیت اختیار کی جو کہ سرداران چکوال کے مخالف گروپ تھا۔ اس گروپ کو ایک ایسے رہنما کی ضرورت تھی جو کہ سرداران چکوال سے مقابلہ کر سکے۔ اس گروپ کے اصرار کے باوجود انھوں نے سیاست کے عملی میدان میں ۱۹۸۵ء میں پہلا قدم رکھا۔

۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی الیکشن میں پہلی مرتبہ ایم این اے منتخب ہوئے۔ دوران کیمپین انتہائی سنجیدہ حکمت عملی سے اپناورک مکمل کیا۔ بڑے جلسے منعقد کیے اور خاص طور پر اس بات کا خیال رکھا گیا کہ ہر دن ایک ہی سمت میں ورک کیا جائے اور پروگرام کے روزانہ کے شیڈول اس طرح ہوں کہ ملحق علاقے ہوں جس سے وقت کی بچت ہو گی اور ہر جگہ وقت پر پہنچنے کے لیے بھی آسانی ہو جائے گی۔ سپیکر قومی اسمبلی کے انتخاب کا مرحلہ پیش آیا تو انھوں نے حکومتی امیدوار خواجہ صفدر کے مدمقابل آزاد امیدوار سید فخر امام کی حمایت کی۔ اس بات سے انھوں نے اس چیز کا ثبوت دیا کہ ملک کی بہتری کے لیے جمہوری نظام کا ہونا ضروری ہے۔ اس اسمبلی میں دوسرا مرحلہ ایوان کے انتخاب کا آیا تو تین نام گردش کرتے رہے۔ الٰہی بخش سومرو، ظفر اللہ جمالی، محمد خان جونیجو۔ بالآخر محمد خان جونیجو ہی وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز ہوئے۔ عبدالمجید ملک نے ان کے اس انتخاب کو یوں بیان کیا ہے:

> "پاکستان کے حکمران ہمیشہ ٹاپ لیول کے ہر عہدے کے لیے ایک ایسے شخص کا انتخاب کرتے ہیں جو ضرر اور حلیم ہو ہماری عسکری اور سیاسی تاریخ میں درجنوں مثالیں موجود ہیں۔"(۴۰)

اگرچہ ذاتی طور پر محمد خان جونیجو ایک شریف النفس اور سیدھے سادھے انسان تھے۔ ۱۹۸۵ء میں لاہور کے ایک جلسے میں تقریب کے دوران وزیر اعظم محمد خان جونیجو نے مارشل لاء کو ختم کرنے کی بات کی جو کہ جنرل ضیا الحق کو اچھی نہ لگی اور ضیا الحق کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھے کہ جس سے وزیر اعظم محمد خان جونیجو کی حکومت کو ختم کر دیا جائے بالآخر ۱۹۸۸ء میں سانحہ اوجڑی کیمپ کا ناخوشگوار واقعہ پیش آیا تو اس کی وجہ سے محمد خان جونیجو کی حکومت کو ختم کر دیا گیا۔ اس وقت کے صدر جنرل ضیا الحق نے آئین کی آٹھویں ترمیم (58-2b) کی تلوار سے حکومت کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد جنرل ضیاء الحق نے ۱۹۸۸ء میں غیر جماعتی الیکشن کرانے کا اعلان کیا۔ لیکن سیاسی اور مذہبی دونوں جماعتوں نے غیر جماعتی الیکشن کی مخالفت کی حتیٰ کہ جب ضیا الحق نے شریعت آرڈیننس جاری کیا تو دوسری جماعتوں نے یہ کہا کہ جنرل ضیا الحق اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے یہ سارے اقدامات کر رہا ہے۔

جنرل ضیاء الحق نے نومبر ۱۹۸۸ء میں انتخاب کرانے کا اعلان کیا۔ لیکن ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء سانحہ بہاولپور میں جنرل ضیاء الحق کی وفات کے بعد اس وقت کے چیئر مین سینٹ غلام اسحٰق خان صدر منتخب ہوئے اور ان کی سربراہی میں نومبر میں انتخابات ہوئے اور جنرل عبدالمجید ملک نے آئی جے آئی کے پلیٹ فارم سے الیکشن میں حصہ لیا اور ان کے مدمقابل ان کے روایتی حریف (سردار محمد اشرف خان نے پیپلز پارٹی کے پلیٹ فارم سے حصہ لیا اور الیکشن میں جنرل عبدالمجید ملک نے کامیابی حاصل کی۔ یہ ان کی دوسری مرتبہ کامیابی تھی اور اس کامیابی میں ان کی سابقہ کارکردگی کا نمایاں کردار تھا۔ اگرچہ اس مرتبہ مرکز میں پیپلز پارٹی نے حکومت بنائی۔ لیکن عبدالمجید ملک نے اپوزیشن کے نمایاں لوگوں میں سے تھے۔

بالآخر کرپشن اور لوٹ مار جیسے سنگین الزامات کی بنیاد پر ۶ اگست ۱۹۹۰ء کو صدر غلام اسحاق خان نے (۵۸۔۲ b) کا استعمال کرتے ہوئے اسمبلیاں تحلیل کر دیں۔

نگران وزیر اعظم غلام مصطفیٰ جتوئی کو بنایا گیا اور عبدالمجید ملک کی فہم و فراست اور بروقت درست سیاسی فیصلوں کی بدولت صدر غلام اسحاق خان نے مشاورت کے بعد انہیں آئل اینڈ گیس و قدرتی وسائل کا وزیر بنایا گیا جہاں انھوں نے قلیل مدت میں مختلف ممالک کے دورے کیے۔ گیس کی قلت کو کم کرنے کے لیے کیونکہ اس وقت ایران اور عراق کی جنگ کی وجہ سے عراق سے گیس کی سپلائی بند ہو گئی تھی۔ ان کے گیس کے متعلق بیرون ممالک کے تمام دورے کامیاب ہو گئے اور انھوں نے نگران وزارت کے ساتھ ساتھ اپنی الیکشن مہم بھی جاری رکھی۔

اکتوبر ۱۹۹۰ء میں عام انتخابات منعقد ہوئے اور عبدالمجید ملک تیسری دفعہ ایم این اے منتخب ہوئے اور اس مرتبہ میاں محمد نواز شریف پہلی مرتبہ وزیر اعظم بنے اور انہیں وزارت خوراک کا قلمدان دیا گیا۔ ان کا شمار نواز شریف کے قریبی ساتھیوں میں ہوتا تھا۔ انھوں نے نواز شریف کے ساتھ اپنی قرابت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"اسمبلی میں اگرچہ بہت سے کہنہ مشق پالیمنٹیرین موجود تھے۔ مگر ان میں سے چوہدری شجاعت، چوہدری نثار علی خان، راجہ ظفر الحق، سرتاج عزیز، شیخ رشید، گوہر ایوب خان اور میں (عبدالمجید ملک) اور میاں نواز شریف کے قریبی مشیروں میں شامل تھے اس اسمبلی میں نوجوانوں کا ایک گروپ بھی سامنے آیا جن کو (Young Turks) کہا جاتا تھا ان میں ملک نعیم، صدیق کانجو، سید نسیم مہدی شاہ عبدالستار لالیکا پیش پیش تھے۔"(۴۱)

اگرچہ عبدالمجید ملک ایک عمر رسیدہ تھے مگر اس کے باوجود ان کا جذبہ جنون جوان تھا۔ انھوں نے خوراک وزراعت کی وزارت میں انقلاب برپا کر دیا اور وزارتی ذمہ داریاں احسن طریقے سے سرانجام دیں۔ اس دوران جب صدر غلام اسحاق خان اور نواز شریف کے درمیان اختلاف ہوئے تو ۱۷ اپریل ۱۹۹۳ء کو وزیر اعظم میاں نواز شریف نے ایک تقریر کی جس میں کہا کہ ڈکٹیشن نہیں لوں گا تو اس کے رد عمل میں صدر اسحاق خان نے آئین کی آٹھویں ترمیم (۵۸۔۲ b) کا اختیار استعمال کرتے ہوئے اسمبلیاں تحلیل کر دیں اور اس کے بعد نواز شریف نے سپریم کورٹ میں پٹیشن دائر کروادی اور ۲۶ مئی کو سپریم کورٹ نے حکومت بحال کر دی۔ سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے پر فوراً عملدرآمد کرایا۔ اسد سلیم شیخ نے اس فیصلے کو ان الفاظ میں بیان کیا۔ اپنی کتاب ہماری دستوری تاریخ ۱۶۰۰ء سے ۲۰۱۸ء تک:

"پاکستان کی عدلیہ کی تاریخ میں ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا تھا کہ عدلیہ نے ایسا حکم دے کر اس پر عملدرآمد کرایا ہو۔ یہ شاید پہلا موقع تھا کہ ایک حکومت جو واپس بھیج دی گئی ہو اور جس کی جگہ تمام اختیارات دے کر نگران حکومت قائم کر دی گئی ہو پھر اسے بحال کیا گیا ہو۔"(۴۲)

حکومت سپریم کورٹ کے فیصلے سے بحال تو ہو گئی لیکن اس کے باوجود صدر غلام اسحاق خان اور وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف کے آپس میں تعلقات بہتر نہ ہو سکے۔ جس کی وجہ سے اور بالآخر دونوں کے مابین گفتگو ہوئی جس کی وجہ سے صدر غلام اسحاق اور میاں نواز شریف دونوں مستعفی ہو گئے اور اس کے بعد چیئرمین سینٹ وسیم سجاد قائم مقام صدر کے عہدے پر فائز ہوئے اور معین قریشی کو نگران وزیر اعظم بنایا گیا۔ اس مختصر مدت میں معین قریشی نے ورلڈ بینک میں کلیدی عہدوں پر فائز ہونے کی وجہ سے ملک میں معاشی اصطلاحات کیں۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو انتخابات کی تاریخ مقرر ہوئی۔ تمام سیاسی جماعتوں نے اپنی الیکشن مہم زور وشور سے شروع کر دی اور سردار محمد اشرف خان پاکستان پیپلز پارٹی سے امیدوار بن کر آئے۔ عبدالمجید ملک کو اس الیکشن کے ابتدا میں مشکل پیش آئی جب چکوال این اے ۴۳ کی ذیلی نشستوں میں ایک نشست پی پی ۱۷ کے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ کیونکہ سلطان عظمت حیات (چو آسیدن شاہ) اور ان کے بھتیجے میجر (ر) سلیم اصغر ملک چیئرمین ضلع کونسل چکوال دونوں ان کے پینل سے پی پی ۱۷ کے لیے خواہش مند تھے۔ جنرل عبدالمجید ملک نے اپنی سیاسی ساکھ کو مزید مضبوط بنانے کے لیے سلطان عظمت حیات (چو آسیدں شاہ) کے حق میں فیصلہ کیا اور پورے پینل نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔

اس مرتبہ ایک بار پھر محترمہ بے نظیر بھٹو نے حکومت بنائی اور اس مرتبہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنی وزارت عظمیٰ کو مستحکم کرنے کے لیے سردار فاروق احمد خان لغاری کو صدر مملکت کے لیے پیپلز پارٹی کی طرف سے نامزد کیا اور جو بالآخر کامیاب بھی ہوئے۔ اگرچہ بے نظیر کا مقصد یہ تھا کہ صدر اور وزیر اعظم کے درمیان تفاق رائے ہو گا۔ مگر یہ مفروضہ غلط ثابت ہوا اور دونوں کے درمیان اختلاف ہو گئے۔ ان اختلافات کی وجہ حکومتی کرپشن اور لوٹ مار تھی۔ حالات وواقعات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلم لیگ نے پیپلز پارٹی کی حکومت کے خلاف "تحریک نجات" کے نام سے تحریک چلائی تو مسلم لیگ کی اس ملک گیر تحریک کا سربراہ جنرل عبدالمجید ملک کو مقرر کیا گیا۔ کرپشن اور لوٹ مار جیسے سنگین الزامات کی وجہ سے صدر فاروق احمد لغاری نے آئین کی آٹھویں ترمیم (b ۲۔۵۸) کا استعمال کرتے ہوئے ۵ نومبر ۱۹۹۶ء کو قومی اور چاروں صوبائی اسمبلیاں تحلیل کر دیں۔ اگرچہ صدر مملکت کے اس فیصلے کے خلاف بے نظیر بھٹو نے سپریم کورٹ میں پٹیشن دائر کی مگر سات ججوں کے بینچ میں سے ایک نے صرف صدر کے اس اقدام کے خلاف فیصلہ دیا مگر چھ ججوں نے اس کے حق میں اکثریتی فیصلے کی وجہ سے بے نظیر بھٹو کی حکومت بحال نہ ہو سکی۔

اسد سلیم کے مطابق:

''سپریم کورٹ کے چھ ججوں نے اس کی توثیق کی جبکہ ایک جج نے جسٹس ضیاء محمود مرزا نے اپنا اختلافی نوٹ لکھا اور کہا کہ صدر کا ۵ نومبر ۱۹۹۶ء کا فیصلہ بر قرار نہیں رکھا جا سکتا جس کے نتیجے میں قومی اسمبلی بحال وزیر اعظم اور ان کی کابینہ بحال کی جاتی ہے۔ بہر حال اکثریتی فیصلے کی وجہ سے بے نظیر کی حکومت اور قومی اسمبلی بحال نہ ہو سکی۔''(۴۳)

چنانچہ سپریم کورٹ نے صدر کے اس فیصلے کو درست قرار دیا جس کے بعد ۳ فروری ۱۹۹۷ء کو ملک میں قومی و صوبائی اسمبلیوں کے انتخاب کا اعلان کیا گیا۔ جنرل عبد المجید ملک نے اس الیکشن میں مسلم لیگ ن سے الیکشن لڑا اور ان کے مدمقابل پیپلز پارٹی کے راجہ منور احمد تھے۔ اس الیکشن میں جنرل عبد المجید ملک نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ اپنی سابقہ روایت کو بر قرار رکھتے ہوئے اس الیکشن میں مسلم لیگ (ن) نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ قومی اسمبلی کی (۲۰۷ میں سے ۱۳۷ نشستیں مسلم لیگ (ن) نے جیتیں) عبد المجید ملک نے مسلم لیگ ن کی اس شاندار کامیابی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''نواز شریف کی اس کامیابی کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان کی پوری تاریخ میں اتنی پارلیمانی سپورٹ کسی کے پاس نہیں تھی تو مناسب ہو گا۔ نواز شریف کی اس پارلیمانی طاقت کو میڈیا نے ''ہیوی مینڈیٹ'' کا نام دیا ہے۔''(۴۴)

نواز شریف دوسری مرتبہ وزیر اعظم کے منصب پر فائز ہوئے تو اس دفعہ انھوں نے عبد المجید ملک کو وفاقی وزیر امور کشمیر شمالی علاقہ جات کا قلمدان دیا۔ اس کے بعد صدر فاروق لغاری اپنے عہدے سے مستعفی ہوئے تو مسلم لیگ کی طرف سے رفیق تارڑ کو صدر منتخب کرایا گیا اور اس کے بعد جب چیف آف آرمی سٹاف کے تقرر کا معاملہ آیا تو جنرل مشرف کو آرمی چیف بنایا گیا۔ اگر چہ ابتداء میں ان کے آپس میں تعلقات بہتر تھے۔ لیکن کارگل آپریشن کی وجہ سے دونوں شخصیات کے درمیان پھوٹ پڑی اور آج تک

دونوں شخصیات ایک دوسرے کو مودر الزام ٹھہراتے ہیں۔ عبدالمجید ملک اپنے گہرے عسکری، سیاسی اور سفارتی تجربے کی بنیاد پر دونوں کو برابر کا قصور وار گردانتے ہیں۔ وزیراعظم نواز شریف کا موقف یہ تھا کہ مجھے اس آپریشن کے متعلق آگاہ نہیں کیا گیا جبکہ چیف آف آرمی سٹاف یہ کہتے تھے کہ میں نے وزیراعظم کے صلاح مشورے سے تمام اقدامات اٹھائے۔

اس کے بعد دونوں کے درمیان اختلاف میں اضافہ ہوتا گیا اور جب جنرل مشرف سری لنکا دورے پر گئے تو وزیراعظم نواز شریف نے ان کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نیا چیف آف آرمی ضیاالدین بٹ کو مقرر کیا۔ لیکن وزیراعظم کے ان تمام احکامات کی راولپنڈی کی ۱۱۱ بریگیڈ نے نفی کر دی جس کو آرمی ٹیک اوور کے وقت استعمال کیا جاتا ہے۔ اس بریگیڈ نے وزیراعظم ہاؤس اور پی ٹی وی اور اس کے ساتھ ساتھ تمام اہم دفاتر میں قبضہ کر لیا حتیٰ کہ جب ضیاالدین بٹ جی ایچ کیو پہنچے تو ان کے لیے گیٹ بھی نہ کھولا گیا اور اس کے ردعمل میں ۱۱۱ بریگیڈ فعال ہوئی حالانکہ حکومت سوچ رہی تھی مشرف کا جہاز پاکستان میں نہ اتارا جائے مگر ایندھن کی اس میں کمی تھی اور بالآخر جنرل مشرف کے ہوائی جہاز کو کراچی میں اتارا گیا۔

اس وقت فوج نے تمام اہم مقامات پر قبضہ کر لیا تھا اور اسی رات جنرل پرویز مشرف نے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے قوم سے خطاب کیا۔ اس کے بعد شریف فیملی کو پابند سلاسل کر دیا گیا اور ایک سال بعد ۱۰ دسمبر ۲۰۰۰ء کو شریف فیملی کو ملک بدر کر کے سعودی عرب بھیج دیا گیا۔

۲۰۰۱ء کو صدر رفیق تارڑ بھی اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گئے اور جنرل پرویز مشرف صدر کے عہدے پر بھی براجمان ہو گئے اور ملک میں ریفرنڈم کروا کے خود کو صدر منتخب کروایا اور ۲۰۰۸ء تک بطور صدر پاکستان اور چیف آف آرمی سٹاف رہے بیک وقت دو عہدے۔ اگرچہ ۲۰۰۲ء میں عام انتخابات کروائے گئے مگر اس میں ایک نئی جماعت مسلم لیگ (ق) نے کامیابی حاصل کی اور نام نہاد جمہوریت کا نام دیا گیا۔

سید علی حسین نقوی کے مطابق:

> "۱۹۹۹ء سے لے ۲۰۰۸ء تک پھر ایک فوجی دور ہم پر مسلط ہو گیا۔ مارشل لاء اور اس فوجی حکومت میں فرق یہ تھا کہ اس نے جمہوریت کو پا یہ زنجیر کیا۔ پہلے چیف ایگزیکٹو اور بغیر الیکشن کے سیاستدانوں سے فوجی حکمت عملی کے تحت اپنے آپ کو فوجی وردی میں صدر منوایا اور نام نہاد جمہوری حکومت قائم کر دی۔ فوجی طاقت کے ساتھ پانچ سال پورے کر کے اور اسی موجودہ کابینہ کے ذریعے سیاسی چالوں کے ساتھ پھر وردی میں صدر کا انتخاب جیت لیا۔"(۴۵)

۲۰۰۲ء میں جب عام انتخابات کا اعلان ہوا تو اس وقت مسلم لیگ ق ایک متحرک سیاسی جماعت کے طور پر سامنے آئی اور میاں محمد اظہر کو اس نئی جماعت کا صدر منتخب کیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ گجرات سے تعلق رکھنے والے چوہدری شجاعت اور چوہدری پرویز الٰہی بھی اس جماعت کے رورواں تھے اور اسٹیبلشمنٹ کی طرف سے پرانے مسلم لیگیوں پر دباؤ ڈالا گیا کہ مسلم لیگ ق میں شمولیت اختیار کر لیں اور اس کے ساتھ ساتھ میاں اظہر اور چوہدری شجاعت نے بھی اپنے اثر ورسوخ کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو اس میں شامل کیا۔

جنرل عبدالمجید ملک نے بھی مسلم لیگ ق میں شمولیت اختیار کی جب ۲۰۰۲ء کے انتخابات کا اعلان ہوا تو اس میں گریجویشن کی شرط لازمی تھی تو عبدالمجید ملک نے اپنا سیاسی جانشین اپنے بھتیجے میجر سلیم اصغر کو منتخب کیا اور اس کو ایم این اے بنوایا۔ اگرچہ عبدالمجید ملک مسلم لیگ ق میں شامل تھے اور ان کی جماعت مشرف کو وردی میں صدر دیکھنا چاہتی تھی مگر یہ پارٹی میٹنگ میں صدر پر کھل کر تنقید کرتے تھے۔

میجر طاہر اقبال کی کامیابی کے بعد انہیں وزیر مملکت برائے ماحولیات اور بعد میں امور کشمیر کی وزارت کا قلمدان دیا گیا اور ان کی اس تمام کامیابی کا کریڈٹ عبدالمجید ملک کو جاتا ہے۔

۲۰۰۱ء میں جنرل مشرف نے لوکل گورنمنٹ کے آرڈیننس کے تحت بلدیاتی انتخاب کرائے پہلی مرتبہ اور دوسری مرتبہ ۲۰۰۵ء میں جنرل عبدالمجید ملک ۲۰۰۲ء کا جنرل الیکشن گریجویشن کی وجہ سے نہ لڑ سکے مگر ۲۰۰۵ء میں بلدیاتی الیکشن کا اعلان ہوا تو ان کے چند دوستوں نے انہیں ضلع ناظم چکوال کا الیکشن

لڑنے کا مشورہ دیا اور بالآخر وہ ضلعی نظامت کا الیکشن لڑنے کے لیے راضی ہو گئے۔ ان دنوں یہ مسلم لیگ ق میں تھے اور مسلم لیگ ق کی طرف سے سابق ضلع ناظم سردار غلام عباس تھے اور سردار کو دو پرویزی قوتوں کی حمایت حاصل تھی۔ جنرل پرویز مشرف اور پرویز الٰہی کی اس نے مسلم لیگ ق کی طرف سے عبدالمجید ملک پر دباؤ ڈلوایا کہ وہ انتخاب نہ لڑیں مگر جب وہ نہ مانے تو ان کی میٹرک کی ڈگری کو چیلنج کر دیا گیا۔ عدالت میں اور یہ ایک عجیب واقعہ تھا کہ ایک لیفٹیننٹ (جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہونے والی شخصیت کے پاس میٹرک کی ڈگری نہ ہو۔ اگرچہ مخالفین کا مقصد ان کے الیکشن مہم کے وقت کو ضائع کرنا تھا۔ مگر سپریم کورٹ کے حتمی فیصلے کے بعد انہیں الیکشن لڑنے کی اجازت دی گئی لیکن اس وقت الیکشن سے تین دن باقی تھے کم وقت ہونے کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ حیرت انگیز واقعہ تھا قومی الیکشن میں ہمیشہ کامیاب رہنے والے بلدیاتی الیکشن میں شکست سے دوچار ہوئے۔

۲۰۰۸ء میں صدر جنرل مشرف کی سرپرستی میں ایک مرتبہ پھر قومی الیکشن ہوئے تو اس دفعہ چکوال میں مسلم لیگ ق کے دو دھڑے تھے۔ میجر گروپ جس کے سربراہ عبدالمجید ملک تھے اور دوسرا گروپ جس کے سربراہ سردار غلام عباس تھے۔ اگرچہ قومی اسمبلی کے ٹکٹ کا حق میجر گروپ کا تھا مگر ۲۰۰۵ء کے بلدیاتی الیکشن میں میجر گروپ کی مخالفت کی وجہ سے انھوں نے میجر گروپ کے مدمقابل اپنے بھائی کو آزاد حیثیت سے الیکشن لڑانے کا فیصلہ کیا تو وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے جنرل عبدالمجید ملک نے اپنے بھتیجے کا ٹکٹ قومی اسمبلی کا واپس کروا دیا اور مسلم لیگ ن کے امیدوار ایاز امیر کی حمایت کی۔ اگرچہ یہ بروقت فیصلہ نہ کرتے تو سردار گروپ آسانی سے الیکشن جیت جاتا۔ لیکن سوائے ایک بلدیاتی الیکشن ۲۰۰۱ء اور ایک جنرل الیکشن ۲۰۰۲ء کے تمام الیکشنوں میں میجر گروپ کا مقابلہ سرداروں سے ہوتا رہا اور ان کی سیاسی کامیابی میں سرداروں کا روایتی سیاسی انداز تھا اور دونوں ایک دوسرے کے سیاسی حریف تھے۔

۲۰۱۳ء کے انتخابات کا اعلان ہوا تو میجر گروپ نے ایک مرتبہ پھر مسلم لیگ ن میں شمولیت اختیار کر لی اور بآسانی سے ٹکٹ میجر گروپ کے سیاسی وارث میجر طاہر اقبال کو مل گیا کیونکہ مسلم لیگ (ن) کے

سابق ایم این اے نے مسلم لیگ فعال کرنے میں کوئی فعال کردار ادا نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے مسلم لیگ (ن) کی قیادت ان سے نالاں تھی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میجر گروپ کے سربراہ نے اپنے گروپ کا مسلم لیگ (ن) میں شمولیت کا اعلان کیا اگرچہ یہ مسلم لیگی تھے اور انہیں اس بات کا احساس تھا کہ انھوں مسلم لیگ (ن) چھوڑ کر مسلم لیگ (ق) میں شمولیت اختیار کی۔ مسلم لیگ (ن) میں انکی دوبارہ شمولیت سے ضلع چکوال میں ن لیگ فعال ہو گئی جس کا کریڈٹ عبدالمجید ملک کو جاتا ہے۔

ہم بھی وہاں موجود تھے۔ میں جنرل (ر) عبدالمجید ملک کی آپ بیتی ہے اور اس میں انھوں نے اپنی ذاتی زندگی کے متعلق بیان کیاہے اور ان کی شخصیت کثیر الجہت تھی۔

وہ ایک فوجی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ گھر میں زمینداری فوج میں ملازمت کا ملا جلا ماحول اس لیے ان کی تربیت میں زمین سے وابستگی کا عنصر عام لوگوں کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ فوجی ملازمت کے دوران جنگی مشقوں اور حکمت نے انہیں ایک مکمل فوجی میں بدل دیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سفارت کاری اور بعد میں سیاست میں آنا ان کی زندگی کے بدلتے پڑاؤ ہیں۔ ان کی زندگی تجربات سے بھرپور ہے۔ وہ عمومی مسائل کو ایک عام آدمی بلکہ ایک سیاست دان سے بھی زیادہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے سیاست میں روایتی سیاست دانوں کی نسبت انھوں نے کہیں زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور برسوں سے پوٹھوہار کی سیاست پر قابض سرداروں اور دیگر بااثر لوگوں کی راہ میں ایک مضبوط دیوار ثابت ہوئے۔ عوامی رجحان اور لوگوں کی نفسیات کے مطابق بروقت فیصلوں نے انہیں اپنے پورے سیاسی کیریئر میں کامیابی سے ہمکنار کیا۔

## د: ”فرزند پاکستان“ اور ”ہم بھی وہاں موجود تھے“ کے سیاسی شعور کا تقابل:

### اشتراکات:

- ”فرزند پاکستان“ اور ”ہم بھی وہاں موجود تھے“ دونوں تصنیفات میں پاکستان کے سیاسی حالات و واقعات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

- "فرزند پاکستان" اور "ہم بھی وہاں موجود تھے" دونوں تصانیف میں جنرل ایوب خان کے مارشل لاء کے خلاف چلنے والی تحریکوں اور ۱۹۶۵ء کے صدارتی انتخابات کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔

- تاشقند معاہدہ کے خلاف پاکستان میں چلنے والی تحریک اور عوامی اضطراب و ہیجان کا ذکر دونوں تصانیف میں موجود ہے۔ اس معاہدہ کے بعد ذوالفقار علی بھٹو جو اس وقت کے وزیر خارجہ تھے انھوں نے احتجاجاً استعفی دیا اور عوام الناس کی ہمدردیاں خوب سمیٹیں اور اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ذوالفقار علی بھٹو نے (پاکستان پیپلز پارٹی) کی بنیاد رکھی۔ اس کا تذکرہ دونوں شخصیات اپنی داستانوں میں کیا ہے۔

- ۱۹۶۸ء میں جنرل ایوب خان نے اپنے سیاسی مخالفین کو پابند سلاسل کر دیا۔ اس کے بعد جنرل ایوب خان کا استعفی اور اقتدار ایک جرنیل جنرل یحییٰ خان کے سپرد کرنا اور اس کے بعد ۱۹۷۰ء کے انتخاب اور اس کے بعد ۱۹۷۱ء کی جنگ اور پاکستان کا دولخت ہونا ذوالفقار علی بھٹو کا اقتدار سنبھالنا۔ بھٹو مخالف قوتوں کا اتحاد ۱۹۷۷ء الیکشن میں دھاندلی کے خلاف چلنے والی اپوزیشن کی تحریک۔ اپوزیشن الائنس قومی اتحاد کے رہنماؤں اور ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان مذاکرات اور ان کی تکمیل سے قبل جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء اور ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کا ذکر دونوں رہنماؤں نے تفصیل سے کیا ہے۔

شیخ رشید احمد اور عبد المجید ملک دونوں پوٹھوہار کے علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا وہ لہٰذا وہ لسانی اور سماجی حوالے سے پوٹھوہار کے لوگوں کی سیاسی تربیت اور سوجھ بوجھ کو زیادہ بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔

- ۱۹۸۵ء کا غیر جماعتی انتخاب قومی اسمبلی میں دونوں شخصیات کے تعارف کا زمانہ تھا۔ اس دوران دونوں رہنماؤں آزادی پارلیمانی گروپ میں شمولیت اختیار کی جس کا مطمع نظر اسمبلی کی آزادی کا اظہار کرنا تھا اور اس کے سربراہ فخر امام تھے۔ جنھوں نے جنرل ضیاء الحق کے سپیکر کے امیدوار خواجہ صفدر کو شکست سے دوچار کیا۔ شیخ رشید احمد اور عبد المجید ملک دونوں ممبران قومی اسمبلی نے فخر امام کا ساتھ دیا۔

- محمد خان جونیجو کے متعلق دونوں رہنماؤں نے ایک جیسے تاثرات بیان کیے ہیں۔ محمد خان جونیجو کو حلیم اور بے ضرر شخصیت کا مالک کہا ہے۔ دونوں رہنماؤں نے کچھ دنوں بعد مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلی۔

- ۱۹۸۸ء کے الیکشن میں دونوں شخصیات نے ایک مرتبہ پھر کامیابی حاصل کی۔ اگرچہ اس مرتبہ مرکز میں پاکستان پیپلز پارٹی کی طرف سے محترمہ بے نظیر بھٹو وزیراعظم پاکستان بنیں اور میاں محمد نواز شریف وزیر اعلیٰ پنجاب بنے تو ان دونوں رہنماؤں نے پنجاب سے تعلق رکھنے کی بدولت انھوں نے عوامی رجحان اور ملکی سیاسی حالات کے پیش نظر میاں محمد نواز شریف کے قریبی رفقاء میں شامل ہوگئے۔ جب صدر غلام اسحاق خان نے اسمبلیاں تحلیل ۱۹۹۰ء کے الیکشن کا اعلان کیا تو دو شخصیات نے اسلامی جمہوری اتحاد جس میں مسلم لیگ اور دوسری جماعتیں شامل تھیں جس کے سربراہ میاں محمد نواز شریف تھے۔ اس کے پلیٹ فارم سے قومی اسمبلی کا الیکشن لڑا اور کامیابی حاصل کی۔ اس الیکشن میں آئی جے آئی نے وفاق میں حکومت بنائی تو میاں محمد نواز شریف (پہلی مرتبہ) وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز ہوئے تو ان دونوں شخصیات کو کابینہ میں شامل کیا گیا اور کابینہ اجلاس میں دونوں رہنماؤں کی رائے کو خاصی اہمیت دی جاتی تھی اور ان کا شمار وزیراعظم کے ۹ قریبی رفقاء میں شامل ہوتا تھا اور ہر اجلاس میں ان کی موجودگی ایک لازمی امر تھا۔ دونوں شخصیات نے اپنے سیاسی کیریئر میں مسلسل کامیابیاں سمیٹی ہیں اور بطور سیاستدان کئی مرتبہ بیرون ممالک دورے کیے ہیں۔ پاکستان کا پیغام بین الاقوامی سطح پر پہنچایا ہے۔

- وزیراعظم میاں نواز شریف اور صدر غلام اسحاق خان کے درمیان سرد جنگ کا آغاز ہوا تو دونوں رہنماؤں نے معاملات کو سنبھالنے کے لیے اپنا بھرپور کردار ادا کیا اور جب صدر مملکت نے 58/2b کی آئینی شق کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وزیر اعظم کو برطرف کیا تو دونوں رہنماؤں نے جمہوری استحکام کے لیے وزیر اعظم کا ساتھ دیا۔ اگرچہ عدالت عظمی کے فیصلے کی وجہ میاں نواز

شریف بحال ہو گئے۔ مگر چند دن بعد صدر اور وزیر اعظم دونوں اپنے اپنے عہدے سے بر طرف ہو گئے تو نگران وزیر اعظم کے لیے دونوں رہنما ایک دوسرے سے پوچھتے رہے کہ کون رہا ہے بالآخر سر تاج عزیز کی ٹیلی فونک گفتگو سے انھوں نے اندازہ لگایا جس میں وہ اچکن کا سائز پوچھ رہے تھے کہ معین قریشی آرہا ہے اور بالآخر دونوں شخصیات کا اندازہ درست ثابت ہوا اور معین قریشی نگران وزیر اعظم بنے۔

- ۱۹۹۳ء کے الیکشن میں اگر چہ دونوں رہنماؤں نے مسلم لیگ (ن) کے پلیٹ فارم سے کامیابی حاصل کی اور پاکستان پیپلز پارٹی کی طرف سے بے نظیر بھٹو دوسری مرتبہ ملک کی وزیر اعظم منتخب ہوئیں۔ تو دونوں شخصیات نے اپوزیشن کا بھرپور کردار ادا کیا اور اس دوران پیپلز پارٹی کی حکومت کے خلاف کرپشن اور لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے مسلم لیگ ن نے تحریک نجات کے نام سے تحریک چلائی تو انھوں نے ہر اول دستے کا کردار ادا کیا۔

- جہاں دونوں شخصیات قومی سیاست (قومی اسمبلی کا ممبر) اور وفاقی وزارتوں کے منصب پر فائز ہوئیں۔ یہاں پر دلچسپ امر یہ بھی ہے کہ ان دونوں رہنماؤں کو بلدیاتی الیکشن میں کامیابی نہ مل سکی۔ شیخ رشید احمد ۱۹۸۳ء میں راولپنڈی سے ڈپٹی مئیر کا الیکشن ہار گئے اور ایک مرتبہ پھر بلدیاتی الیکشن میں قسمت آزمانے کا ارادہ کیا اور مسلم لیگ میں بھی شمولیت اختیار کی اور ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ اس طرح جنرل عبدالمجید ملک نے بھی ۲۰۰۵ء کو ہونے والے بلدیاتی الیکشن میں ضلعی نظامت چکوال کے لیے حصہ لیا اگرچہ اس وقت کی حکمران جماعت مسلم لیگ ق میں شامل تھے اولاً تو ٹکٹ لینے میں ناکام رہے اور اس کے باوجود الیکشن لڑا اور اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

قومی الیکشن میں فاتح رہنے والے دونوں رہنما بلدیاتی الیکشن چند سازشوں کی وجہ سے ہار گئے۔

شیخ رشید احمد اور جنرل عبدالمجید ملک دونوں رہنماؤں نے اپنے اپنے علاقوں میں ترقیاتی کاموں پر توجہ کے ساتھ ساتھ ملکی سطح پر کام کرنے کی طرف توجہ مبذول کی۔

شیخ رشید احمد اور عبدالمجید ملک دونوں رہنماؤں کو اپنے علاقے کے مذہبی لوگوں کی حمایت ہر دور میں رہی اور اس کے ساتھ ساتھ ملکی سیاسی صورتحال کو اپنی تصانیف میں ایک انداز میں بیان کیا ہے۔

- دونوں رہنماؤں کا کوئی خاندانی سیاسی پس منظر نہیں تھا۔ بلکہ دونوں شخصیات نے اپنے اپنے خاندانوں میں پہلی مرتبہ میدان سیاست میں قدم رکھا۔ اس وجہ سے ان کا طرز سیاست و حکمرانی روایتی سیاست سے مختلف اور عوامی خدمت کا جذبہ اپنے اپنے علاقوں کی تعمیر و ترقی پیش نظر تھا۔

''فرزند پاکستان'' اور ''ہم بھی وہاں موجود تھے'' دونوں داستانوں کے مطالعے سے اس بات کی آگاہی ہوتی ہے کہ دونوں رہنماؤں کے انداز فکر میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ حالات وواقعات کو بیان کرنے کے لیے تاریخی شعور تسلسل اور روانی بھی پائی جاتی ہے۔

دونوں تصانیف پاکستان کی سیاسی تاریخ میں اہمیت کی حامل ہیں۔

## اختلافات:

- ''فرزند پاکستان'' از شیخ رشید احمد نے اپنے زمانہ طالب علمی ایوب خان اور مادر ملت کے صدارتی الیکشن سے لے کر ۱۹۹۵ء تک کے ملکی سیاسی حالات وواقعات کو اپنی داستان حیات میں قلم بند کیا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس ''ہم بھی وہاں موجود تھے'' از جنرل عبدالمجید ملک نے پاکستان بننے یعنی ۱۹۴۷ء سے لے کر ۲۰۱۵ء تک کے حالات وواقعات کو اپنی داستان حیات میں بیان کیا ہے۔
- شیخ رشید احمد زمانہ طالب علمی سے ہی میدان سیاست کے شاہسوار بنے۔ کالج لائف کے دوران ہی متعدد مرتبہ طلباء یونین میں کامیابی حاصل کی اور اس کے بعد ملکی سیاست میں قدم رکھا تو یہاں پر بھی مسلسل کامیابیاں ان کے مقدر میں آئیں۔ اس کے برعکس جنرل عبدالمجید ملک نے اپنی جوانی فوج میں گزاری اس کے بعد سفارت اور بعد میں سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔

- شیخ رشید احمد عملی سیاست سے قبل مختلف سیاسی اور سماجی تحریکوں کا حصہ بنے جس میں نظام مصطفیٰ کی تحریک اور تحریک استقلال میں رہے جبکہ جنرل عبدالمجید ملک فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد میدان سیاست میں آئے۔

- ملک میں جب پہلی مرتبہ مارشل لاء کا نفاذ عمل میں لایا گیا تو شیخ رشید احمد نے کم عمری کے باوجود اس کی واضح مخالفت کی جس کا واضح ثبوت انھوں نے مادر ملت فاطمہ جناح اور جنرل ایوب خان کے درمیان ہونے والے صدارتی الیکشن میں فاطمہ جناح کا ساتھ دیا۔ جبکہ جنرل عبدالمجید ملک فوج میں ہونے کی وجہ سے ملک کے اندر لگنے والے پہلے مارشل لاء کے کاغذات کی تیاری میں مصروف عمل رہے۔

- شیخ رشید احمد کو مخالفین پر تند و تیز اور تنقیدی گفتگو کرنے کی وجہ سے متعدد مرتبہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ جبکہ جنرل عبدالمجید ملک دھیمے مزاج کی سیاست کی بدولت انہیں ایسی صورتحال کبھی پیش نہ آئی۔

- شیخ رشید احمد کو الیکشن مہم کے دوران کبھی بھی ان کے رشتہ داروں اور گھر والوں کی معاونت حاصل نہیں رہی اور ان کے بھائی اور رشتے دار ان کی الیکشن کمپین میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ جبکہ جنرل عبدالمجید ملک کے قریبی رشتہ دار الیکشن کے دوران اپنی اپنی ملازمتوں سے چھٹی لے کر ان کی انتخابی مہم چلاتے تھے۔

- شیخ رشید احمد کو پاکستان کی طرف سے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرنے کا شرف حاصل ہے اور اس وقت یہ خارجہ سٹینڈنگ کمیٹی کے ممبر تھے جبکہ جنرل عبدالمجید ملک فوڈ اینڈ ایگریکلچر آرگنائزیشن (FAO) جو کہ اقوام متحدہ کا ایک اہم ترین ذیلی ادارہ ہے اس کے چیئر مین منتخب ہوئے۔

- شیخ رشید احمد نے سیاست میں اپنے پبلک سیکر ٹریٹ کو ایسانام دیا جو کہ ایک شہرت اختیار کر گیا(لال حویلی) جبکہ جنرل عبد المجید ملک اپنے عوامی سیکر ٹریٹ کو اس قسم کا کوئی دلچسپ نام نہ دے سکے۔

- شیخ رشید احمد اور عبد المجید ملک کے مزاج میں فرق نے دونوں کے یکساں موقف کے باوجود ایک دوسرے سے کوسوں دور لگتے ہیں ۔ مثلاً لوگوں کی بہتری ملکی اداروں کی اصلاح اور اس جیسے دوسرے امور میں دونوں کا موقف بالکل ایک جیسا ہے۔ مگر شیخ رشید احمد کا مزاج ایک روایتی سیاست دان کا ہے۔ جس کے لفظوں کی کاٹ کے آگے مخالفین کی کوئی پیش نہیں چلتی جبکہ اس کے بر عکس جنرل عبد المجید ملک کی سنجیدگی اور کم گوئی انہیں ممتاز رکھتی ہے اور مخالفین ان کے بر دبار رویے کی وجہ سے اوچھاوار کرنے سے کتراتے ہیں۔

- اگرچہ شیخ رشید احمد نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں خطاب کیا اور پاکستان کے موقف کو بہتر انداز میں پیش کیا مگر بحیثیت مجموعی مراکش وغیرہ میں بطور سفیر خدمات سرانجام دینے اور فوجی ملازمت کے دوران بیرون ملک دوروں میں جنرل عبد المجید ملک ایک بہتر نظم ونسق اور گفتگو کے حامل شخص نظر آتے ہیں جن کا تجربہ امور خارجہ میں شیخ رشید احمد کی نسبت کہیں زیادہ وسیع اور متنوع ہے۔

- شیخ رشید احمد ایک عمومی کاروباری شخص ہیں۔ جنھوں نے اپنے مضبوط اداروں اور اوالعزم شخصیت کی بدولت اقتدار کی غلام گردشوں تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کی جبکہ جنرل عبد المجید ملک نے قیام پاکستان قبل ہی فوج میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور قیام پاکستان کے بعد پاکستانی فوج میں خدمات سرانجام دیں اور ایک ممتاز جنرل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ اس طرح ایک جنرل کے بطور لوگوں میں تعلق اور پہچان کی خاطر انہیں تگ ودو کے اس کٹھن مرحلے سے گزرنا نہیں پڑا جو شیخ رشید احمد کی شخصیت میں تھا ایک فوجی پس منظر کی وجہ سے علاقہ مکینوں میں عبد المجید ملک کی پہچان کافی عرصے سے موجود رہتی تھی۔ جس میں سیاست میں آنے کے بعد مزید اضافہ ہوا۔

۔ شیخ رشید احمد نے زمانہ طالب علمی سے سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور لوگوں کی سمجھ بوجھ اور فہم کے مطابق فیصلے بھی کیے تھے۔ چنانچہ وہ تاریخ کے ان حصوں سے زیادہ واقف ہیں جن میں وہ خود شامل رہے اور لوگوں کے ساتھ سیاسی جدوجہد میں حصہ لیا ان کا یہ تجربہ ایک سیاسی کارکن کے طور پر تھا۔ جو اپنے گردوپیش میں وقوع پذیر حالات اور مواقع کو گہری نظر سے دیکھتا ہے۔ جبکہ ملک گیر سیاست کے ساتھ اس کا کم تعلق ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جنرل عبدالمجید ملک آغاز ہی میں پاکستانی فوج کے دست وبازو بنے اور ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں میں میدان جنگ میں خدمات سر انجام دیں۔ ان کی یہ خدمات اتنی بلند پایہ تھی کہ فوج اور سول اور انتظامیہ کی نظروں میں آ گئے۔ ذوالفقار بھٹو، ایوب خان اور جنرل ضیاء الحق کے ساتھ ان کا قریبی تعلق رہا اس لیے ان کے واقعات میں تاریخی اور سیاسی شعور کے ساتھ ساتھ ذاتی مشاہدے اور تجربے کی آمیزش نظر آتی ہے۔ جبکہ شیخ رشید احمد کے ہاں عوامی اور صحافیانہ گفتگو زیادہ موجود ہے۔ جس نے دونوں کے سیاسی شعور میں خاصا فرق پیدا کیا ہے۔ آسان الفاظ میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں شیخ رشید احمد کی ابتدائی سیاسی زندگی میں لوگوں کی خواہشات اور تحریکات کا زیادہ پہلو موجود ہے۔ دوسری جانب عبدالمجید ملک کی تصنیف مشاہدات کی آماجگاہ نظر آتی ہے۔ جو ان کے سیاسی شعور اور مشاہدے دونوں کی گواہ ہے۔

شیخ رشید احمد اور عبدالمجید ملک مقتدر پاکستانی شخصیات میں سے ہیں۔ جن کی گفتگو پسند اور ناپسند طریقہ زندگی اور زندگی گزارنے کے اصول وضوابط میں بہت زیادہ اشتراکات اور اختلافات موجود ہیں۔ ان اشتراکات اور اختلافات میں دونوں شخصیات میں ہم آہنگی اور تضاد کو واضح کیا ہے۔

اشتراکی اور اختلافی نقاط کے باوجود دونوں لوگوں کی زندگی میں آسانیاں لانے انہیں بہتر زندگی کے حصول میں مدد دینے کی کوشش کرتے ہیں جس کی وجہ سے اختلافات کی بالعموم بڑی وجوہات بھی چھوٹی محسوس ہوتی ہیں۔ دونوں کی منزل ایک ہے یعنی پاکستان کی ترقی استحکام اور لوگوں کی خوشحالی کا خواب مگر دونوں میں عوامی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے مختلف طریقہ اپنانے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔

مذکورہ باب میں سیاسی شعور کے اصطلاحی اور لغوی مفہوم کو مرتب کرنے اور شیخ رشید احمد کی تصنیف ''فرزندہ پاکستان'' اور جنزل عبدالمجید ملک کی تصنیف میں ''ہم بھی وہاں موجود تھے'' دونوں رہنماؤں کے سیاسی شعور کو سمجھنے اور پاکستانی سیاست کے حالات وواقعات سے مکمل آگاہی فراہم ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ پاکستانی تاریخ میں بھی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس باب میں دونوں رہنماؤں کے سیاسی شعور کے ساتھ ساتھ ان کے سیاسی فیصلوں اور نقطہ نظر میں موجود اشتراکات اور اختلافات کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔

## حوالہ جات


۱۔ فرہنگ تلفظ، مرتبہ شان الحق حقی، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، طبع سوئم، ۲۰۰۸ء، ص ۶۴۸

۲۔ قومی انگریزی، اردو لغت، مولف ڈاکٹر جمیل جالبی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول، ۱۹۹۲ء، ص ۱۵۱۱

۳۔ جامع اردو لغت، مولف وارث سرہندی، علمی کتاب خانہ، لاہور، طبع سوئم، ۲۰۰۳ء، ص ۹۳۶

۴۔ فرہنگ آصفیہ، مرتبہ: مولوی سید احمد دہلوی، جلد سوئم، اردو سائنس بورڈ، لاہور، بار اول ۱۹۸۶ء، ص ۱۴

۵۔ An Introduction to political Science by Soltau, 1951, P.1

۶۔ ارسطو، سیاسیات ارسطو، مترجم سید نذیر نیازی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۵۹ء، ص ۵۰

۷۔ ڈیگارٹس، بحوالہ اسلام سندیلوی، "ماحول اور مزاج" سفینہ ادب، لاہور، س۔ن، ص ۱۴۹

۸۔ Quincy Wright The Study of International Relations, New York, 1995, P133

۹۔ انور شعور، روزنامہ جنگ راولپنڈی، ہفتہ ۱۰ مارچ ۲۰۱۲ء، ص ۶

۱۰۔ ارسطو، سیاسیات ارسطو، مترجم سید نذیر نیازی، ص ۵۰

۱۱۔ http//www.merriam.wbster.com/dictionary/Politics, Dec-2001, PM ۳:۰۰

۱۲۔ محمد امجد عابد، ڈاکٹر، عصری شعور کی اصطلاح اور اردو تنقید، مشمولہ: زبان وادب، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۶ء، شمارہ ۱۹، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد، ص۱۰۹

۱۳۔ ایضاً، ص۱۰۹

۱۴۔ قومی انگریزی اردو لغت، جمیل جالبی، ایضاً، ص۴۳۵

۱۵۔ جامع علمی اردو لعت، ص:۹۳۶

۱۶۔ قومی انگریزی اردو لغت، جمیل جالبی، ایضاً، ص۱۵۱۰ء

۱۷۔ ارسطو، سیاسیات ارسطو، مترجم: سید نذیر نیازی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص۵

۱۸۔ http//www.Jass(Just accociates) info @ Justassociates.org
Political Consciousness: A Perpertual Quest by Valerie Miller, May 31, 2002

۱۹۔ ایضًا

۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ جمہوریت، تاریخ پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص۱۸۷

۲۲۔ ریاض احمد، شیخ، پاکستان، جمہوریت اور فوجی مداخلتیں، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص۹۰۔۸۹

۲۳۔ رشید احمد، شیخ، فرزند پاکستان، رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۳ء، ص۲۷

۲۴۔ صفدر احمد، ڈاکٹر، پاکستان تاریخ وسیاست، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص۹۴

۲۵۔ رشید احمد شیخ، فرزند پاکستان، ص۸۳

۲۶۔ ایضاً، ص۱۱۳

۲۷۔ مجاہد حسین، پاکستان بد عنوانی کی حکمرانی نگارشات، پبلشرز لاہور، ۲۰۱۶ء، ص۸۲

۲۸۔ ایضاً، ص۸۲

۲۹۔ رشید احمد شیخ، فرزند پاکستان، ص۱۴۵

۳۰۔ ایضاً، ص۱۴۷

۳۱۔ ایضاً، ۲۰۲

۳۲۔ حسن عسکری رضوی، پروفیسر، ملٹری اینڈ پالٹکس، بحوالہ پاکستان ایک عمومی مطالعہ، از ڈاکٹر محمد اعظم چوہدری، وفاقی اردو یونیورسٹی کراچی، ۲۰۰۴ء، ص۲۰۷

۳۳۔ عبد المجید ملک، ہم بھی وہاں موجود تھے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص۴۹

۳۴۔ ایضاً، ص۷۰

۳۵۔ ایم اے چودھری، مارشل لاء کا سیاسی انداز، جنگ پبلشرز پریس، او سر آغا خان روڈ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۱۲۸

۳۶۔ عبد المجید ملک، ہم بھی وہاں موجود تھے، ص۹۵

۳۷۔ تقی الدین، حافظ، پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور تحریکیں فکشن ہاؤس لاہور، ۱۹۹۵ء، ص۴۱۹

۳۸۔ عبد المجید ملک، ہم بھی وہاں موجود تھے، ص۱۵۷

۳۹۔ شاہد صفدر، دھن دھرتی، ڈیٹالنک، ولی سینٹر، بلیو ایریا اسلام آباد، اشاعت اول، اپریل ۱۹۹۲ء، ص۳۱

۴۰۔ عبدالمجید ملک، ہم بھی وہاں موجود تھے، ص۱۸۴

۴۱۔ ایضاً، ص۲۰۸

۴۲۔ سلیم اسد، شیخ، ہماری دستوری تاری، ۱۶۰۰ء سے ۲۰۱۸ء تک، فکشن ہاؤس لاہور، اشاعت دوم، ۲۰۱۸ء، ص۵۲۵

۴۳۔ ایضاً، ص۵۳۰

۴۴۔ عبدالمجید ملک، ہم بھی وہاں موجود تھے، ص۲۳۰

۴۵۔ علی حسنین نقوی، سید، ترقی پسند اردو نثر کے پچاس سال، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص۲۵

## باب سوم:

# شیخ رشید احمد اور عبدالمجید ملک کی آپ بیتیوں میں سماجی شعور کا تقابل

## الف: سماجی شعور (تعارف و مفہوم):

انسان اپنے امورِ زندگی انجام دینے کے لیے مختلف لوگوں اور دیگر عناصر سے تعلقات استوار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان اس کائنات میں ایک جز کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ دیگر مختلف اجزا کے ساتھ باہمی روابط استوار کر کے ملکیت کی طرف بڑھتا ہے۔ اس عمل میں ایک طرف اس کی اپنی انفرادیت قائم رہتی ہے تو دوسری طرف وہ دیگر عناصر کے ساتھ لازم و ملزوم کے تعلقات بھی استوار کرلیتا ہے۔ یہ تعلقات مختلف روایات اور اقدار کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں اور انہی سماج تشکیل پاتا ہے۔

سماجی شعور کی بحث میں جب ہم سماج کے مفہوم کا جائزہ لیتے ہیں تو سماج ہندی زبان کا لفظ ہے جس کے لیے اردو میں معاشرہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ معاشرہ بھی عربی سے اردو میں آیا ہے اور اس کے معنی اکٹھا رہنے کے ہیں۔ انگریزی میں سماج اور معاشرے کے لیے سوسائٹی (Society) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کی تعریف ویبسٹر نیو انگلش ڈکشنری میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> "People in general thought of as living together in organized communities with shared laws, traditions and values, the people of a particular country area, time etc thought of especially as an organized community people who are fashionable and wealthy." (1)

اس تعریف کی رو سے سماج، معاشرہ یا سوسائٹی انسانوں کے ایک ایسے گروہ کو کہا جائے گا جس کے مختلف عناصر کے تو اس میں گہرے روابط اور مضبوط تعلقات ہوں گے لیکن وہ اپنی منفرد شناخت بھی رکھتا ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک سماج کے مختلف عناصر آپس میں مل کر اپنی ایک ایسی مخصوص سماجی شناخت بناتے ہیں جو دوسرے سماجوں یا معاشروں سے اسے منفرد کرتی ہے۔

کسی بھی سماج کی تشکیل میں اس سماج کے ذیلی عناصر کا کردار خاص اہم ہوتا ہے۔ سماج کے ذیلی عناصر میں سے سب سے زیادہ اہمیت انسان یا فرد کو حاصل ہے۔ فرد سماج کی ایک اکائی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی دیگر اکائیوں کے لیے ایک ایسے مرکز کی حیثیت بھی رکھتا ہے جس کی طرف دیگر اکائیاں رجوع کر کے سماج کی تشکیل کرتی ہیں۔ یوں فرد سماج کا مرکز قرار پاتا ہے۔

سماج میں ہونے والی مثبت اور منفی سرگرمیاں براہ راست نہ صرف فرد کو متاثر کرتی ہیں کہ ان مثبت و منفی سرگرمیوں کا محرک بھی کافی حد تک فرد ہی ہوتا ہے۔ تاریخ عالم پر نگاہ دوڑائی جائے تو تمام مہذب اور غیر مہذب سماجوں میں فرد ہی مرکز بنا رہا ہے۔ کہیں سماج سے انسان یا فرد کو منفی کر دینے سے اس سماج کا نہ صرف شیرازہ بکھر جاتا ہے بلکہ وہ سماج اپنی شناخت اور حیثیت بھی کھو بیٹھتا ہے۔

فرد اور سماج کے تعلق کو دیکھا جائے تو جہاں سماج کی تشکیل میں فرد بنیادی کردار ادا کرتا ہے وہاں فرد کی بقا اور خوش حالی بھی سماج ہی کی مرہون منت ہے۔ گویا سماج اور انسان ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ سماج کے بغیر انسان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ جاتی۔ اس کی بڑی وجہ سماج کے وہ اثرات ہیں جو ہر دم انسان پر پڑتے رہتے ہیں اور انسان ان اثرات کے زیر اثر اپنی زندگی کے ارتقائی مراحل طے کرتا چلا جاتا ہے۔ انسان سماج سے متاثر بھی ہوتا ہے اور اس پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔

تہذیب و ثقافت کسی بھی سماج کی خوش حالی اور ترقی کے لیے بنیادی عنصر کی اہمیت رکھتے ہیں۔ بغور دیکھا جائے تو تہذیب و ثقافت کا منبع بھی انسان کی ذات ہی قرار پاتی ہے۔ مختلف انسانوں یا افراد کے رویے

اور اقدار تہذیب و ثقافت کو جنم دیتے اور پروان چڑھاتے ہیں۔ جوں جوں تہذیب و ثقافت پروان چڑھتی چلی جاتی ہے توں توں سماج میں بھی ان تیزی اور ثقافتی اقدار کے زیر اثر تبدیلی پیدا ہوتی جاتی ہے اور سماج اس تبدیلی سے متاثر ہو کر خود کو تہذیب کے قالب میں ڈھالتا چلا جاتا ہے۔ اگر کسی سماج میں بسنے والے افراد تہذیبی و اخلاقی اور ثقافتی اقدار سے بے بہرہ ہوں تو وہ سماج بھی غیر مہذب سماج کی صورت اختیار کرتا چلا جاتا ہے اور ایک وقت پھر ایسا بھی آتا ہے کہ وہ غیر تہذیبی اور غیر ثقافتی اقدار اس سماج کی خاص پہچان بن کر سامنے آنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے دور میں بھی مختلف منفی سرگرمیاں اور غلط اقدار بہت سے سماجوں کی پہچان بن کر رہ گئے ہیں۔ گویا یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسانوں یا افراد کے رویے، طرز عمل اور اقدار سماج کو پہچان عطا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اور کسی بھی سماج میں تغیر و تبدل پیدا کرنے میں انسانی رویوں اور اقدار کا گہرا ہاتھ ہوتا ہے۔

تہذیب و ثقافت سماج اور انسان دونوں کو راہ راست پر رکھتی ہیں یہ تہذیب و ثقافت جب مذہب سے ہم آہنگ ہو کر سماج میں ابھرتی ہیں تو ان میں پختگی آتی جاتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ افراد کا تعلق خواہ کسی بھی مذہب سے کیوں نہ ہو، مذہبی اقدار اور مذہبی تقدس ان کے لیے خاص اہمیت رکھتے ہیں اور انسان مذہب سے والہانہ لگاؤ رکھنے کے ساتھ ساتھ اس سے گہری عقیدت بھی رکھتا ہے۔ مذہبی اقدار اور مذہبی روایات سماج کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ انسان کو جس حد تک وابستگی اور عقیدت مذہبی اقدار سے ہوتی ہے۔ اتنی کسی اور سے نہیں ہوتی۔ مذہب انسان کے اعمال میں نظر آئے یا نہ آئے لیکن اس کی عقیدت مذہب سے گہری ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بظاہر مذہب پر عمل نہ کرنے یا کم کرنے والا شخص بھی مذہب کے خلاف کچھ بھی سننے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ جب انسانی سوچ، رویوں اور اقدار پر مذہب کی حکمرانی ہوتی ہے تو سماج بھی ان مذہبی اقدار میں ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جہاں بعض سماجوں کی پہچان ان کی مثبت یا منفی سرگرمیاں اور اقدار میں وہاں بہت سے سماجوں کی پہچان ان کے مذہب کی بنیاد پر بھی ہوتی ہے۔

سماجی شعور کسی سماج میں پائی جانے والی روایات اور اقدار کا عکاس ہوتا ہے کسی بھی سماج میں بسنے والے انسان جس طرح مختلف عقائد و نظریات کے حامل ہوتے ہیں اسی طرح ان انسانوں کے ذاتی ذہنی اور نفسیاتی رجحانات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان مختلف انسانوں کا چیزوں کو دیکھنے اور ان سے اثر قبول کرنے کا انداز بھی دوسروں سے خاصا مختلف ہوتا ہے۔ یہ تمام امور ان کے زندگی گزارنے کے طرز اور سماج میں ان کے انداز کی پہچان بنتے ہیں۔ سماج کا مطالعہ اگر گہرائی اور گیرائی میں جا کر کیا جائے تو یہ انفرادی اعمال اور نفسیاتی رجحانات سامنے آتے ہیں یہی اعمال آگے چل کر سماجی تشکیل کرتے ہیں۔ اگر کسی سماج کے زیادہ افراد مثبت سوچ کے حامل ہوں گے اور مثبت طرز عمل اختیار کریں گے تو لازمی طور پر وہ سماج مثبت اقدار کا حامل سماج بن کر ابھرے گا۔ اس کے برعکس اگر کسی سماج میں بسنے والے افراد کی زیادہ تعداد منفی سوچ اور منفی سرگرمیوں کی حامل ہو گی تو اس سماج کی پہچان بھی اسی نوعیت کی بنے گی۔

سماج کی تشکیل میں اقتصادیات کا عمل دخل بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کسی سماج کی اقتصادی صورت حال موجودہ عہد میں اس سماج پر خاص اثر انداز ہوتی ہے۔ ایک ایسا سماج جو اقتصادی حوالے سے پسماندہ ہو گا وہاں کے لوگوں کا طرز زندگی بھی پسماندہ ہو گا۔ ان کے سوچنے کا انداز اور ان کی اقدار سے بھی پسماندگی جھلکتی نظر آئے گی یہاں اقدار سے مراد وہ سماجی اقدار ہیں جو ہر دم تغیر پذیر رہے ہیں۔ اس تناظر میں دیکھیں تو آج بھی دنیا کے وہ خطے جہاں ضروریات زندگی کی فراہمی مشکل سے ہوتی ہے وہاں کے لوگوں میں ترقی اور خوش حالی کم ہی نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس وہ خطے جو اقتصادی حوالے سے خاصے مضبوط ہیں وہاں سماجی اقدار اور روایات کا چلن بھی بہتر نظر آتا ہے۔ یہ بات یاد رہے کہ یہاں بات سماجی اقدار کی ہو رہی ہے اخلاقی اقدار کی نہیں۔ اخلاقیات کا تعلق انسان کے طرز عمل اور سوچ سے ہوتا ہے یہ انفرادی بھی ہوتی ہیں۔ ایک انسان اخلاقی طور پر اچھا بھی ہو سکتا ہے اور بُرا بھی۔ لیکن جب سماجی اقدار کی بات ہو گی تو اس سے مراد لازمی طور پر وہ اقدار اور روایات ہوں گی جو سماج میں بسنے والے تمام افراد کا مجموعی تاثر پیش کرتی ہیں۔ وہ سماج جو اقتصادی حوالے سے مضبوط ہوتے ہیں وہاں معیار زندگی بلند ہونے کی وجہ سے سماجی

اقدار بھی مثبت ہوتی ہیں یہ الگ بات ہے کہ دولت کی بے جا ہوس انسان کو کبھی چین نہیں لینے دیتی اور یہ ہوس ہر آنے والے دن کے ساتھ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور سماجی عناصر (افراد) اس ہوس کو پورا کرنے کے لیے بعض اوقات منفی سرگرمیوں میں بھی ملوث ہوتے چلے جاتے ہیں لیکن مجموعی طور پر اقتصادی خوشی ہی کے حامل سماجوں میں سماجی اقدار خاصی مضبوط ہوتی ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اقتصادی خوشحالی کے حامل سماج کے باشندے بنیادی ضروریات کی فراہمی وافر ہونے کی وجہ سے بے فکری کے ساتھ آگے بڑھنے کا سوچتے ہیں اور بہت سے مثبت افکار تشکیل پاتے ہیں۔

اس کے برعکس ایسے سماج جہاں بنیادی انسانی ضروریات کی فراہمی ممکن نہ ہو یا ان کا حصول خاص مشکل ہو وہاں کے باشندوں کی فکر اور سوچ کا محور بنیادی ضروریات کی فراہمی ہوتا ہے اور ان کی ساری تگ و دو اسی مقصد کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ یوں سماجی اقدار ان کی اس محدود سوچ کے دائرے میں مقید ہو کر رہ جاتی ہیں۔

اقتصادی حوالے سے سماجی اقدار کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اقتصادی خوش حالی سماج میں صرف مثبت فکر اور مثبت اقدار کو ہی فروغ نہیں دیتی بلکہ ہوس اور حرص جیسی منفی اقدار بھی پروان چڑھنے لگتی ہیں۔ حرص اور ہوس کی یہ روش صرف دولت تک ہی نہیں رکتی بلکہ اقتصادیات سے آگے بڑھتے ہوئے طبقاتی تفریق تک پہنچ جاتی ہے۔ دولت مند اور مقتدر طبقہ غریب اور مزدور طبقے کو اپنے سے ہیچ سمجھنے لگتا ہے اور ان سے کام لے کر کم اجرت دیتا ہے۔ اس کام میں سرمایہ دار بھی شامل ہو جاتا ہے جو ان غریبوں اور مزدوروں کے ذریعے اپنے سرمائے میں دن رات اضافہ کرتا چلا جاتا ہے لیکن سماج کے ان غریب اور مزدور لوگوں کی زندگیاں روز بروز اجیرن ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یوں سماج میں طبقاتی تفریق اور طبقاتی کشمکش جنم لینے لگتی ہے یہ طبقاتی تفریق سماج پر خاص انداز میں اثر ڈالتی ہے۔ سماج میں پروان چڑھنے والے رویے اور اقدار اس طبقاتی تفریق سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔

سماج میں پائی جانے والی طبقاتی تفریق کا سب سے بڑا سبب دولت اور اقتدار ہے۔ ان چیزوں پر قابض لوگ نہیں چاہتے کہ کوئی ان کے مقابلے پر آئے۔ یہی دولت اور اقتدار انسانوں کو مختلف گروہوں اور طبقوں میں تقسیم کیے رکھتا ہے جس سماج میں امیر اور غریب، حاکم اور محکوم اور سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان یہ طبقاتی تفریق جتنی وسیع ہوتی چلی جائے گی وہ سماج اتنا ہی زیادہ ذلت اور زوال میں گرتا چلا جائے گا۔ اس طبقاتی تفریق سے جہاں ایک طرف محکوم، غریب اور مزدور طبقہ کی زندگی اجیرن ہو گی وہیں دوسری طرف حاکم، سرمایہ دار اور دولت مند طبقے کے ہاں اضافی زوال بھی پیدا ہو گا گویا زوال پذیر کا یہ عمل مختلف حوالوں سے دونوں (اعلیٰ اور ادنیٰ) طبقات میں جاری رہے گا۔ یہی زوال سماجی اقدار کو نیست و نابود کرنے کا باعث بنتا ہے جس کی وجہ سے سماج کا شیرازہ بکھرتا چلا جاتا ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سماج کی تشکیل میں مختلف عناصر اپنے اپنے انداز میں اور اپنے اپنے دائرے میں رہتے ہوئے کردار ادا کرتے ہیں۔ ان سماجی عناصر کا مرکز انسان یا فرد ہوتا ہے جس کے گرد سماج کے باقی عناصر گھومتے ہیں۔ اگر سماج کو اجزاء میں تقسیم کرنا ممکن ہو تو ہر جز اپنی خاص انفرادی شناخت بھی قائم رکھے گا لیکن اس کی زندگی میں ارتقاء اور اس کی بقا کے مسائل درپیش ہوں گے۔ کیونکہ سماج کے مختلف تشکیل عناصر ایک دوسرے سے مل کر جب اجتماعی طرز عمل اختیار کرتے ہیں تو وہ اجتماعی طرز عمل سماج کی تشکیل کا باعث بنتا ہے۔ اس اجتماعی طرز عمل میں ہر جز خود کو کل میں ضم کرتا چلا جاتا ہے جس کے نتیجے میں سماج ایک کلیت کا عکاس بن کر ابھرتا ہے اس کلیت سے مختلف

اجزا انفرادی طور پر بھی جلا پاتے اور ارتقا کے مراحل طے کرتے چلے جاتے ہیں۔

سماج کے اس تصور کے بعد جب ہم پاکستانی سماج اور اردو ادب میں سماجی شعور کی طرف بڑھتے ہیں تو ہمارے سامنے پاکستانی سماج کے کئی زاویے ابھرتے ہیں، قیام پاکستان کے وقت ہجرت کے عمل میں ثقافتی اور سماجی اقدار کی جس طرح شکست و ریخت ہوتی اس نے پورے سماج کو ہلا کر رکھ دیا۔ تاریخ کی یہ بہت بڑی ہجرت تھی جس میں صرف انسان اور مال و اسباب ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں ہوئے بلکہ نقلِ

مکانی کے اس عمل کے دوران میں جو قتل و غارت اور عصمت دری کے واقعات رونما ہوئے وہ انسانیت کے نام پر ایک بد نما داغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہجرت کے عمل میں خون ریزی کا جو بازار گرم ہوا اس نے نہ صرف انسانیت کے ایک بہت بڑے طبقے کو موت کی وادی میں پہنچا دیا بلکہ عصمت دری اور قتل و غارت کے واقعات نے اس وقت کے لوگوں کی نفسیات پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب طبقے میں سے جن لوگوں نے اس ہجرت میں حصہ لیا تھا یا اس ہجرت کے عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ان کی تحریروں پر قیام پاکستان کے بعد کئی سالوں تک اس ہجرت کے اثرات واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

ہجرت کے عمل میں ایک طرف تو لٹے پٹے مہاجرین اپنا گھر بار، مال و اسباب چھوڑ کر پاکستان میں داخل ہو رہے تھے تو دوسری طرف مفاد پرست عناصر بھی سرگرم عمل تھے۔ یہ مفاد پرست عناصر ایسے تھے جو ہر سماج میں پائے جاتے ہیں ان کے نزدیک انسانی جان اور ناموس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ان کا اول و آخر مقصد اپنے مفادات کا حصول ہوتا ہے جس کی خاطر وہ دھوکا دہی اور قتل و غارت سمیت کچھ بھی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں ایسے ہی مفاد پرست عناصر اس وقت پاکستانی سماج میں بھی سرگرم ہو گئے تھے جب ہندوؤں اور سکھوں کی متروکہ املاک ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کو الاٹ کی جارہی تھیں۔ ان مفاد پرست عناصر نے جعلی کلیم داخل کروا کر بہت سے مہاجرین کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا اور بہت سی املاک ہتھیا لیں اس کے ساتھ ساتھ سماجی سطح پر اقدار کی پامالی بھی عروج پر تھی۔ لُٹے پٹے مہاجرین اپنی زندگی کی گاڑی کو دھکیلنے کے لیے ناگوار کام کرنے پر بھی مجبور تھے اور مفاد پرستوں نے ان کی مجبوریوں سے خوب فائدہ بھی اٹھایا۔ ان امور نے پاکستانی سماج کو شروع ہی سے غلط راستے پر ڈال دیا۔

سماج اور سیاست کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ سیاست نہ صرف سماج سے پروان چڑھتی ہے بلکہ سماج بھی سیاست سے متاثر ہوتا ہے۔ سیاسی استحکام، سماجی اقدار کو عروج کی طرف لے جاتا ہے جب کہ اگر کوئی ملک سیاسی سطح پر انتشار کا شکار ہو تو اس کے سماج میں بھی انتشار کی کیفیت رواج پانے لگتی ہے۔

پاکستان کے ابتدائی سالوں کے سیاسی حالات نے بھی پاکستانی سماج کو گہرا متاثر کیا۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی وفات اور پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خاں کے قتل سے پیدا ہونے والا سیاسی خلا آسانی سے پر نہ ہو سکا اور شروع ہی سے ملک میں سیاسی و سماجی دونوں حوالوں سے غیر تسلی بخش صورت سامنے آنے لگی۔ دوسری طرف ہندوستان تھا جس نے پہلے دن سے ہی پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا تھا اس کی طرف سے ہونے والی ریشہ دوانیاں بھی سماج میں شکست و ریخت کا سبب بنتی رہیں۔

پاکستانی سماج پر نو آبادیاتی اثرات بھی واضح طور پر پڑے۔ انگریزوں نے اس خطے پر سو سال کے قریب حکمرانی کی۔ حکمرانی کے اس دور میں نہ صرف اس خطے کے وسائل کو لوٹا گیا بلکہ اس خطے کی تہذیب، ثقافت، تمدن اور اقدار کو بھی بدلنے کی کوشش کی گئی اور یہ کوشش کافی حد تک کامیاب بھی رہی جس کے نتیجے میں فرنگی روایات اور اقدار اس خطے میں رواج پاتی چلی گئیں۔ شادی بیاہ، خوشی و غمی اور دیگر مواقع سمیت سماج کے مختلف پہلوؤں پر انگریزی اقدار نے غلبہ جمائے رکھا۔ سماج میں انگریزی اقدار اس قدر رائج ہوتی چلی جا رہی تھیں کہ لباس اور انداز خود ونوش تک فرنگی اقدار میں ڈھلتے چلے گئے اور ان اقدار کو اپنانے والے اس طرز عمل پر فخر بھی کرتے تھے۔

ہجرت اور نو آبادیات کے اثرات کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے سماج کی طرح پاکستان کے سماج کو متاثر کرنے والے عناصر میں بیسویں صدی کی تیز رفتار ٹیکنالوجی کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔ بیسویں صدی کو ایجادات کی صدی کہا جاتا ہے۔ اس صدی میں ہونے والی ایجادات نے جہاں ایک طرف سماج میں انسان کے لیے بہت سی سہولیات فراہم کیں وہیں دوسری طرف بہت سی سماجی اقدار کو زوال بھی آیا۔

بیسویں صدی میں تیز رفتار ٹیکنالوجی نے جب صنعت کاری کو فروغ دیا تو سماج میں طبقاتی تفریق پہلے سے زیادہ پروان چڑھنے لگی۔ صنعت کاری کا عمل خاصے سرمائے کا متقاضی ہوتا ہے اور یہ سرمایہ سماج کے چند افراد کے پاس تھا۔ جب صنعتی عمل کو عروج حاصل ہوا تو چند افراد پر مشتمل یہ سرمایہ دار طبقہ ایک بہت بڑے طبقے کے طور پر ابھرا۔ یہ طبقہ افرادی حوالے سے تو کم تھا لیکن سرمائے کی وجہ سے اس کا اثر و رسوخ پورے سماج تک پھیلا ہوا تھا۔ صنعت کاروں اور سرمایہ داروں نے سماج کے مزدوروں اور غریبوں کی مجبوریوں سے خوب فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے صنعتیں لگائیں اور ان صنعتوں میں دن رات غریب لوگ اور مزدور طبقہ کام کرتے تھے۔ ان کی محنت کی وجہ سے پیداوار میں اضافہ ہوا لیکن یہ اضافہ صرف صنعت کار اور سرمایہ دار کے سرمائے میں اضافہ کا باعث بنا جب کہ غریب اور مزدور کی زندگی میں سوائے زیادہ محنت اور زیادہ کام کرنے کے اور کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی۔ اس صورت حال سے سماج میں طبقاتی تفریق میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور طبقہ اشرافیہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔

ایجادات اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے گھریلو زندگی کے حوالے سے بھی سماج پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ گھروں میں سہولیات زیادہ آنے کی وجہ سے فرصت کے لمحات طویل ہوتے چلے گئے لیکن یہ طوالت سماجی اقدار کو مضبوط کرنے کی بجائے کھوکھلا کرنے کا باعث بنتی چلی گئی۔ سماج میں غفلت اور تساہل پسندی بڑھتی چلی گئی۔ جب انسان کی جگہ مشین نے لے لی تو انسان کے دل سے انسان کی قدر بھی رخصت ہوتی چلی گئی۔ دوسری طرف انسان مشینوں کا غلام بن کر رہ گیا وہ مشین کے ساتھ چلنے پر مجبور ہوتا چلا گیا۔ یوں سماج کے سب سے اہم عنصر کی آزادی سلب ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی صلاحیتوں کا بھی استحصال ہونے لگا۔ اس استحصال نے بھی سماج کو خاصا متاثر کیا۔

سیاسی حوالے سے مقتدر طبقہ کی ایوان اقتدار میں ہونے والی سازشوں نے بھی سماج کو متاثر کیا۔ سیاسی سطح پر اکثریت کو اقلیت میں اور اقلیت کو اکثریت میں بدلنے کی غلط روش نے پاکستان کو سیاسی اور سماجی حوالے سے خاصا نقصان پہنچایا۔ سقوط ڈھاکہ کے المناک سانحہ کے عناصر میں بھی ایسے عناصر کا خاصا عمل دخل تھا، سقوط ڈھاکہ کی صورت میں مشرقی پاکستان کے الگ ہو کر بنگلہ دیش بن جانے کے واقعہ نے بھی پاکستانی سماج کو خاص طور پر متاثر کیا۔ اس سانحہ نے نہ صرف ملکِ عزیز کو دولخت کر دیا بلکہ ایک ہی وطن کے باشندوں کے دلوں اور ذہنوں میں ایک دوسرے کے لیے نفرت کے الاؤ بڑکا دیئے۔ قومیت کا وہ جذبہ جو پہلے قیام پاکستان اور بعد میں ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران میں دیکھا گیا تھا سقوط ڈھاکہ کے سانحہ نے اس جذبہ قومیت پر کاری ضرب لگائی۔ یہ ضرب لوگوں کے اذہان اور قلوب پر لگی یہی وجہ ہے کہ سماج کے ہر طبقے نے اس عظیم سانحہ پر اپنے غم و غصے کا اظہار کیا اس کے ساتھ ادب میں بھی اس سانحے پر بہت کچھ تحریر کیا گیا۔ پاکستانی سماج کو متاثر کرنے والے سیاسی عناصر میں محلاتی سازشوں کے ساتھ ساتھ فوجی آمریت کا بھی اہم کردار رہا ہے۔ ملک میں کئی بار جمہوریت کو پٹڑی سے اتار کر آمریت کے نفاذ سے اس سماج کو گہری طرح متاثر کیا۔

پاکستان سماجی کی یہ تصویر ظاہر کرتی ہے کہ پاکستانی سماج شروع ہی سے گونا گوں کیفیات کا حامل رہا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ پاکستان نے وقت گزارنے کے ساتھ ساتھ ترقی کی بہت سی منازل بھی طے کی ہیں اور عالمی سطح پر اپنا کردار بھی ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ساکھ کو بہتر بھی بنایا ہے۔ لیکن سماجی سطح پر مختلف عناصر کے منفی رویوں نے پاکستانی سماج کو گہرا متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنی اصل منزل سے دور بھی کیے رکھا ہے۔

سماج کی تشکیل میں کردار ادا کرنے والے عناصر کے باہمی روابط اور ایک دوسرے کے لیے خدمات سماج کو بہتری اور ترقی کی راہ پر گامزن کرتے ہیں۔ کسی سماج کے تشکیلی عناصر جس قدر زیادہ ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک دوسرے کو تقویت دینے کا باعث بنیں گے وہ سماج اسی قدر زیادہ ترقی کرے گا تشکیلی عناصر کے آگے بہت سے ذیلی اجزا ہوتے ہیں، ان ذیلی اجزا میں رابطہ کا ہونا سماج کی بہتر تشکیل میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ ذیلی اجزاء کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ انسان سماج کا بہت بڑا عنصر ہے اب ایک ہی سماج میں رہنے والے انسانوں کے آگے مزید کئی گروہ ہوتے ہیں جن میں سرمایہ دار، جاگیر دار، صاحبان اقتدار، غریب مزدور شامل ہیں، یہ سب سماج کے عناصر میں جب ان سماجی عناصر کا باہمی تعلق مضبوط اور پائیدار ہو گا تو سماج ترقی کی منازل طے کرے گا۔

پاکستانی سماج کے حوالے سے دیکھا جائے تو قیام پاکستان سے اب تک ان سماجی عناصر کا باہمی تعلق مضبوط اور پائیدار نہیں ہو سکا۔ اس کی بڑی وجہ سرمایہ دار اور جاگیر دار کی وہ ذاتی ہوس اور حرص ہے جو وہ اپنے مفادات کے حصول کے لیے دل میں پالتا رہتا ہے اور اپنے سرمائے اور جاگیر میں اضافے کی سوچ ہی اسے دوسروں کا استحصال کرنے پر بھی آمادہ کرتی ہے۔ یوں اان مختلف عناصر کے درمیان خلیج وسیع ہوتی جاتی ہے جس کی وجہ سے پاکستانی سماج ابھی تک اپنی منزل سے کوسوں دور ہے۔ جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے تو قیام پاکستان سے اب تک اردو شاعری اور نثر دونوں میں پاکستانی سماج کی عکاسی کی گئی ہے۔ قیام پاکستان سے قبل بھی پریم چند اور دیگر کئی تخلیق کاروں نے ادب اور سماج کا رشتہ جوڑے رکھا۔

اردو ادب کی دیگر اصناف کی طرح آپ بیتی میں بھی پاکستانی سماج کی عکاسی ملتی ہے۔ آپ بیتی سماجی عکاسی بہتر انداز میں کر سکتی ہے کیوں کہ آپ بیتی نگار خود اس سماج کا عنصر ہوتا ہے اور سماج میں ہونے والی تمام سرگرمیوں سے براہ راست متاثر ہوا ہوتا ہے۔ اس نے وہ سب کچھ خود دیکھا ہوتا ہے جو اس کے سماج پر گزرا ہوتا ہے اور جب وہ آپ بیتی لکھتے ہیں تو اس کے یہی تجربات الفاظ کی صورت میں صفحہ قرطاس پر منتقل ہوتے ہیں اور سماج کی حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں۔

اردو میں آپ بیتی کی روایت خاصی طویل ہے۔ مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے آپ بیتیاں تحریر کی ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے ذیل میں معروف سیاست دان شیخ رشید احمد کی آپ بیتی ''فرزند پاکستان'' اور عبدالمجید ملک کی آپ بیتی '' ہم بھی وہاں موجود تھے ''کی آپ بیتی میں سماجی شعور کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ان دونوں آپ بیتیوں میں سماجی شعور کا تقابل بھی پیش کیا جاتا ہے تاکہ پاکستانی سماج کے ساتھ ساتھ دنیا کے مختلف سماجوں کے حوالے سے ان دونوں آپ بیتی نگاروں کے مشاہدارت اور تجربات کو سامنے لا جا سکے۔

## ب: شیخ رشید احمد کی آپ بیتی ''فرزند پاکستان'' میں سماجی شعور:

شیخ رشید احمد کا تعلق خطہ پوٹھوہار کے علاقے راولپنڈی سے ہے۔ ان کا شمار نہ صرف پوٹھوہار بلکہ عصر حاضر میں پاکستان کے نمایاں ترین سیاست دانوں میں سے ایک ہیں۔ سیاست دان ایک ایسا ماہر نباض ہوتا ہے جو سماجی رویوں کی بہتر انداز میں عکاسی کرتا ہے۔ شیخ رشید احمد کو سماجی تعلقات کو مضبوط کرنے کا فن ابتدا ہی سے آتا تھا۔ ''فرزند پاکستان'' اگرچہ شیخ رشید احمد کی سیاسی خودنوشت ہے مگر سیاست اور سماج کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ شیخ رشید احمد نے ''فرزند پاکستان''میں سماجی منظر نامے کو بھی بیان کیا ہے۔ خاص طور پر سماجی رویوں اور سماجی اقدار کے سیاست پر اثرات کی جھلک ''فرزند پاکستان'' میں نظر آتی ہے۔

شیخ رشید احمد کالج اور گلی محلے کی سیاست سے ابھرے تھے۔ ان کا عوام کے ساتھ گہرا رابطہ رہا ہے اور اب بھی ہے۔ اپنے حلقے کے عوام میں وہ گھل مل کر رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں عوام کے مزاج اور سماجی اقدار کی جھلک بھی پائی جاتی ہیں۔ سیاست اور سماج کا حسین امتزاج اس خود نوشت کا نمایاں وصف قرار دیا جاسکتا ہے۔

آپ بیتی کے آغاز میں '' میرا خاندان'' کے عنوان سے انھوں نے اپنے خاندانی حالات بیان کیے ہیں۔ انھوں نے انتہائی غیر جانب داری کے ساتھ اپنے خاندان کی پسماندہ حالت کو بیان کیا ہے اور کہیں بھی مبالغے سے کام نہیں لیا۔ اپنے بچپن کا ذکر کرتے ہوئے شیخ رشید احمد نے اس سماجی صورت حال کو بھی بیان کیا ہے جو ان پڑھ لوگوں کے ہاں پائی جاتی ہے۔ وہ دور جب تعلیم عام نہیں ہوئی تھی۔ لوگوں میں تاریخ یاد رکھنے کا نہ رجحان تھا نہ تصور اس دور میں بچوں کی پیدائش یا کسی بھی اہم واقعے کو موسم یا کسی دوسرے واقعے سے منسوب کر کے یاد رکھا جاتا تھا۔ شیخ رشید احمد سماجی روّیے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''والدہ مرحومہ کے مطابق میں ۹ محرم الحرام ۱۹۵۰ء کو پیدا ہوا جب کہ سرکاری دستاویزات پر ۱۷ فروری ۱۹۵۰ء کی تحریر ہے، میرے والد مرحوم اور والدہ مرحومہ دونوں ان پڑھ تھے اس لیے بچوں کی پیدائش کو حادثات اور موسموں کے حوالے سے ہی یاد رکھا جاتا تھا۔'' (۲)

یہ روش بوڑھے لوگوں کے ہاں آج بھی کسی نہ کسی صورت میں رائج ہے۔ آج بھی سماج کے بزرگ لوگ کسی واقعے کو کسی دوسرے اہم واقعے کی نسبت سے یاد کرتے ہیں۔ ایسا سماج میں تاریخ یاد رکھنے کے عمل سے روگردانی کا نتیجہ ہے۔ اس روگردانی کی وجہ تعلیم سے دوری قرار دی جاسکتی ہے۔

شیخ رشید احمد نے ''فرزند پاکستان'' میں اپنے بچپن کے حالات بیان کرتے ہوئے ان سماجی سرگرمیوں کی خوب عکاسی کی ہے جو اس وقت کے سماج کے بچوں میں رائج تھیں۔ کھیلوں کا تذکرہ ہو یا اپنی عادت کا شیخ رشید احمد نے انتہائی غیر جانب داری اور بے باکانہ انداز میں سچ کو بیان کیا ہے۔ یہی سچ ان کے دور کے مختلف سماجی زاویوں کی وضاحت کرتا نظر آتا ہے۔

شیخ رشید احمد نے " فرزند پاکستان " میں اپنے بچپن کے احوال بیان کرتے ہوئے سماج میں مذہب کے زیر اثر رائج مختلف سرگرمیوں کی بھی عکاسی کی ہے۔ بچپن کا دور جو کہ ایک طرح سے کھلنڈرا دور ہوتا ہے اس دور میں ذہن سوچ کی بجائے بصارت پر زیادہ کام کرتا ہے۔ بچہ جس کام کو اپنے سامنے ہوتا دیکھتا ہے اس کی طرف رغبت اختیار کرتا ہے۔ شیخ رشید احمد کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ سماج میں اہل تشیع کے ہاں ماتم کا ذکر وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> "میں شروع ہی سے جذباتی تھا۔ شور و ہنگامہ بہت پسند تھا ہمارا گھر صرافہ بازار اور بھابڑا بازار والی سڑک پر تھا۔ جس کی کھڑکی سے ہر آنے جانے والے پر نظر رہتی تھی۔ محرم کا جلوس شاہ چن چراغ سے ہوتا ہوا میرے گھر کے سامنے سے گزرا کرتا تھا۔ اس جلوس کے آگے بچوں کی ایک ٹولی بھی ماتم کرتی تھی بعض اوقات زنجیروں سے بھی ماتم ہوتا تھا۔ ایک دفعہ میں گھر کے نیچے سبیل پر پانی پلا رہا تھا نہ جانے کیا ہوا کہ میں نے قمیص اتار کر کمر کے ساتھ باندھ لی اور چھریاں لے کر زور زور سے ماتم شروع کر دیا بچوں میں ماتم کرنے کا مزہ نہ آیا تو بڑے آدمیوں کی ٹولی میں چلا گیا۔ میں ماتم کا مرکز بنا ہوا تھا کہ گھر کی کھڑکی سے میری والدہ کی نظر پڑ گئی اور انھوں نے چلانا شروع کر دیا۔ اتنے میں میرے والد نے مجھے ٹانگ سے کھینچ کر باہر نکالا اور دو تین لگا دیں۔ گھر پہنچا تو والدہ نے بھی پٹائی کر دی۔" (۳)

اس اقتباس سے جہاں ایک طرف سماج میں موجود ماتم کی رسم کی عکاسی ہوتی ہے وہاں ایک کھلنڈرنے بچے کے طور پر شیخ رشید احمد کے بچپن کے اطوار کا بھی علم ہوتا ہے اس اقتباس کو گہری نظر سے دیکھا جائے تو شیخ رشید احمد کے اس طرح ماتم میں شامل ہونے کے پیچھے مذہبی جذبہ کارفرمانہ تھا بلکہ ان کی اس طبیعت اور مزاج کا عمل دخل تھا جو ان کے بقول شروع ہی سے انھوں نے شور وغل اور ہنگامہ کی پسندیدگی والا پایا تھا۔ یہ ان کے سماج کا ان پر اثر تھا کہ وہ سماج کی ہنگامہ خیزی سے بہت جلد متاثر ہو جاتے تھے اور سماج کا یہ اثر ان پر اس قدر زیادہ ہوتا تھا کہ وہ میدان عمل میں نکل کھڑے ہوتے تھے۔

ماتم کے ساتھ ساتھ شیخ رشید احمد نے "فرزند پاکستان" میں اہل سنت والجماعت کے مذہبی اجتماعات اور مناظروں کی بھی عکاسی کی ہے۔ انھوں نے مذہبی اجتماعات اور سماج میں ان کے بارے میں رائج مختلف اصطلاحات کی بھی عکاسی کی ہے۔ ان مذہبی اجتماعات کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

> "سکول کے ساتھ ساتھ میں محلے کی اہل سنت والجماعت او اہل دیو بند کی مساجد کی تقریبات میں بھرپور شرکت کرتا تھا۔ ان دنوں حاضر ناظر اور درود و سلام کے مسائل پر مناظرے ہوا کرتے تھے جن میں بھرپور شرکت کرتا تھا۔ رات کے وقت گھر والے باہر نہیں نکلنے دیتے تھے۔ اس لیے رات کے جلسوں کی خبریں صبح اٹھ کر صوفی ابراہیم سے لیا کرتا تھا۔ ان دنوں شہر میں ع اور غ کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی یعنی سید عارف اللہ شاہ قادری اور شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان صاحب۔" (۴)

" فرزند پاکستان میں موجود شیخ رشید احمد کے اس بیان میں سماجی حوالے سے دو اہم باتوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ایک تو مختلف مکاتب فکر کی طرف سے مختلف مذہبی مسائل پر مناظرے کرنے کا رجحان جو آج بھی سماج میں جاری ہے۔ ہر مذہبی گروہ اپنے عقائد و نظریات کو درست اور دوسروں کو باطل قرار دیتا ہے۔ ایسا ہی فرزند پاکستان میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور معاشرت پر زور دینے کی بجائے حاضر ناظر اور درودو سلام کے مسائل پر منبر پر بڑھ چڑھ کر تقاریر اور مناظرے کیے جاتے تھے۔ سماج میں موجود بہت سے جذباتی لوگ ان مناظروں میں بھرپور شرکت بھی کرتے اور دوسرے فرقے کے لوگوں کو نیچا دکھانے کی کوشش میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا تھا۔

دوسری بات جو اس بیان سے سماجی حوالے سے ظاہر ہوتی ہے وہ سماج میں رواج پا جانے والی مختلف اصطلاحات کے حوالے سے ہے۔ پاکستانی سماج میں خاص طور پر یہ رواج عام ہے کہ کسی کے نام یا کسی اہم عمل کی وجہ سے ان کے لیے کوئی سماجی اصطلاح خود بخود گھڑ لی جاتی ہے اور پھر وہ اس قدر سماج میں رائج ہو جاتی ہے کہ اس شخصیت کی پہچان ہی اس اصطلاح کے ذریعے ہونے لگتی ہے۔

شیخ رشید احمد کی شخصیت کا بنیادی حوالہ سیاست ہے۔ وہ کالج دور سے ہی سیاسی سرگرمیوں میں نہ صرف حصہ لیتے تھے بلکہ ذہن میں ایک ایسے سیاست دان کا خواب بناتے رہے جو ایوان اقتدار تک بھی پہنچ سکتا تھا۔ انھوں نے اس خواب کی تعبیر کے لیے خوب محنت بھی کی اور تعبیر پائی بھی۔ اس عمل کے دوران میں انھوں نے جس طرح اپنی سیاست کا نقشہ ابتدائی ادوار کے حوالے سے پیش کیا ہے وہ سماجی سطح پر سیاست دانوں کے طرز عمل کا بہترین عکاس بن کر ابھرا ہے۔

سیاست دانوں کا ہر کام اپنی سیاست کے لیے ہوتا ہے۔ انھوں نے کسی سے کوئی بھلائی بھی کرنی ہو تو بدلے میں اپنی سیاسی حیثیت کی مضبوطی ہی کی توقع رکھتے ہیں۔ یہ ہماری سیاست کا مزاج بن چکا ہے۔ دوسری طرف سماج میں موجود افراد بھی اسی رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں۔ وہ ایسے لوگوں کو ووٹ دیتے ہیں جو ان کے کام کروائے۔ ملک و قوم کے اجتماعی مفاد کی بجائے گلی، محلے اور بازار کے مفادات ہماری سیاسی و سماجی زندگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس منظر نامے میں شیخ رشید احمد اپنی ابتدائی سیاست کا احوال یوں بیان کرتے ہیں:

> ”سکول میں ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بڑا ہو کر بلدیاتی سیاست میں حصہ لوں گا اور کالج میں ہی اسمبلی کی نشست پر نظر جمائے بیٹھا تھا کہ بغیر پیسے اور برادری کے اس شہر کی سیاست میں کتنی محنت درکار ہوگی۔ اگر میں نے کسی دوست کے گھر ٹیلی فون لگوایا تو یہ بھی سوچا کہ بڑا ہو کر اس کے گھر کو اپنا دفتر بناؤں گا اور ایسا ہی ہوا۔“ [۵]

”فرزند پاکستان“ کو پاکستان کے سماجی منظر نامے کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ شیخ رشید احمد نے اس خود نوشت میں پاکستانی سماج کا بہترین تجزیہ پیش کیا۔ انھوں نے اپنے عہد میں پاکستانی سماج میں خواندگی کی شرح اور لوگوں کی جمہوریت پسندی کو بھی بیان کیا ہے ایک جگہ سماج کی اس صورت حال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پاکستان میں خواندگی کی شرح اگرچہ بہت کم ہے بمشکل (۲۶ فی صد) لیکن اس کے باوجود عام لوگ جمہوریت کے بہت شیدائی ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ناخواندگی اور سیاسی بلوغت کی کمی کے باعث جمہوری ادارہ کو فروغ نصیب نہیں ہو سکا لیکن اداروں کی ناکامی کے باوجود لوگوں میں جمہوریت کی تڑپ ختم نہ ہوئی تھی۔ پاکستان جمہوری عمل کے ذریعے معرض وجود میں آیا تھا اور عوام نے ۱۹۶۴ء کے انتخابات میں اپنی جمہوری بلوغت کا ثبوت مہیا کر دیا تھا۔'' (۶)

عوام کی جمہوریت پسندی اور شرح خواندگی کے ساتھ ساتھ شیخ رشید احمد کے اس بیان میں اس امر کی بھی عکاسی ہوتی ہے کہ سماجی اور انتظامی ڈھانچے پر ناخواندگی اور سیاسی بلوغت کے گہرے اثرات پڑے تھے۔ ان اثرات کی وجہ سے جمہوری اداروں کو زیادہ فروغ حاصل نہ ہو سکا تھا یہی وجہ کہ پاکستان میں جمہوریت زیادہ بہتر انداز میں پھل پھول نہ سکی تھی۔ اس کے باوجود سماجی منظر نامے پر نگاہ دوڑائی جائے تو عام انسان بھی جمہوریت پسند ہی نظر آتا ہے۔ جمہوریت اور جمہوری عمل سے لوگوں کی گہری وابستگی ہی اس سماج کا حقیقی سیاسی منظر نامہ تشکیل دیتی ہے۔

پاکستانی سماجی منظر نامے پر بعض واقعات نے گہرے اثرات ڈالے تھے۔ یہ اثرات ایسے تھے کہ یوں قوم یک جان ہو گئی تھی۔ ایسے ہی واقعات میں سے ایک اہم واقعہ ستمبر ۱۹۶۵ء کا ہے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں بھارت نے پاکستان پر جنگ مسلط کی تو پورے سماج میں وہ اتحاد اور یکسانیت سامنے آئی جس کی نظیر برصغیر کی تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں شیخ رشید احمد ابھی سکول کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس دوران میں بھارتی جارحیت نے پاکستانی سماج کو کس طرح ایک کر دیا اس کی ایک جھلک '' فرزند پاکستان '' سے ملاحظہ ہو:

'' ستمبر ۱۹۶۵ء میں جب بھارت نے رات کے اندھیرے میں پاکستان کی سرحدوں کو پامال کیا تو میں اس وقت سکول میں تھا۔ ان دنوں شہر میں پٹھان مجاہدین اگلے محاذ پر جانے کے لیے جہاد میں شرکت کے لیے آتے تھے۔ رات کو ان کے لیے کھانا جمع کیا جاتا تھا جس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا اور دن کو بھی جہاد فنڈ کے عطیات جمع کرتا... جنگ میں عوام کے جذبات قابل دید تھے۔ سارا شہر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے جنگ میں شریک ہے۔'' (۷)

اس جنگ کے دوران میں تو پاکستانی عوام نے خوب جوش و جذبے کا مظاہرہ کیا اور ہندوستان کو ناکوں چنے چبوائے لیکن عوام کی قربانیاں اپنے دفاع تک جب محدود کر دی گئیں اور معاہدہ تاشقند کے تحت فوجوں کی واپسی کا فیصلہ ہوا تو عوام کے جذبات جس طرح مجروح ہوئے اس بارے شیخ رشید احمد لکھتے ہیں:

"لوگوں کو بہت جلد ہی مایوسی ہوئی جب جنگ بندی کے بعد سوویت یونین کی زیر سرپرستی ایوب خان اور لال بہادر شاستری کے درمیان اعلان تاشقند کے نام سے ایک معاہدہ ہوا جس سے سارے ملک میں افسردگی اور غم و غصہ کا اظہار کیا گیا کیونکہ قوم دہلی کے لال قلعے پر سبز ہلالی پرچم لہرانے کے جذبات رکھتی تھی۔ اس لیے اعلان تاشقند کے خلاف پاکستان میں شدید ردعمل ہوا۔" (۸)

اعلان تاشقند کے بعد کی سماجی صورت حال کو اپوزیشن نے اپنے حق میں استعمال کیا اور ایوب خان کے خلاف تحریک کا آغاز کر دیا۔ ایوب خان کے دور کی سماجی اور اقتصادی صورت حال کو شیخ رشید احمد بیان کرتے ہیں:

"ایوب خان کے دور حکومت میں بلاشبہ غیر معمولی اقتصادی ترقی ہوئی تھی لیکن کوئی نمایاں معاشرتی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی چنانچہ اپوزیشن نے جب اعلان تاشقند کے خلاف تحریک شروع کی تو طلبا بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے۔" (۹)

اس جنگ کے نتائج اور معاہدہ تاشقند نے پاکستانی سماج میں خاصی ہلچل پیدا کی۔ یہ ہلچل مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی آخر ایوب خان کے اقتدار کے خاتمے پر ختم ہوئی۔

شیخ رشید احمد کی "فرزند پاکستان" میں سماجی حوالے سے ایک اور اہم بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ پاکستانی سماج میں جو شخص ایک بار جیل چلا جائے وہ دوسروں کے لیے قابل نفرت ٹھہرتا ہے خواہ وہ بے گناہ ہی کیوں نہ ہو یا کسی عظیم مقصد کے لیے کوئی سزا ہی کیوں نہ بھگت رہا ہو۔ سماج میں جیل اور ہتھکڑی صرف مجرموں کے لیے بن کر رہ گئی ہے۔ ہتھکڑی اور جیل تک لے جانے والے اسباب میں صرف مجرم ہونا

ہی نہیں بلکہ بعض اوقات انتقامی کارروائیاں جو خصوصاً مقتدر طبقے کی طرف سے ہوتی ہیں وہ بھی ان جیلوں اور ہتھکڑیوں کا سبب بن جاتی ہیں لیکن سماج میں جو بھی جیل یا ہتھکڑی کے ساتھ نظر آتا ہے وہ مجرم قرار پاتا ہے۔ اس سماجی روش کا تجزیہ خود شیخ رشید احمد کو بھی ہوا تھا وہ اس منفی سماجی رویے کی عکاسی یوں کرتے ہیں:

> " شام کے وقت پولیس گارڈ آئی اور گاڑی میں بٹھا کر پنڈی ریلوے سٹیشن لے آئے۔ اٹھتی ہوئی جوانی تھی اور حسین نوجوان تھا جو عورت میرے ہاتھ میں ہتھکڑی دیکھتی تو ہاتھ ملنا شروع ہو جاتی۔ ریلوے سٹیشن پر دیکھتے ہی ایک عورت بولی " کیڈا سوہنا جوان اے تے کرتوت کڈے بھیڑے نیں " یعنی کتنا خوبرو جوان ہے اور کام کتنے برے۔ ایک عورت بے ساختہ بولی کہ " پتر اپنے ول ویکھ تے گناہواں توتوبہ کر " غرض کہ کسی نے مجھ سے پوچھا ہی نہیں کہ میں کس جرم میں ہوں جس ڈبے میں مجھے بٹھایا گیا اس کی اکثریت مجھے جیب تراش سمجھ رہی تھی۔"(١٠)

یہ وہ منفی سماجی روش ہے جو ہمارے سماج میں رواج پاتی جا رہی ہے۔ لوگ بن سوچے سمجھے بغیر جانے ہر اس شخص کو پیشہ ور مجرم سمجھ لیتے ہیں جس کے ہاتھ میں ہتھکڑی لگی ہو۔

شیخ رشید احمد سیاست میں وارد ہونے والے ایسے شخص ہیں جنھوں نے حالات کی ستم ظریفی کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اپنی محنت سے گلی محلے سے نکل کر ایوان اقتدار تک رسائی حاصل کی۔ وہ سماج کے مزاج کو سمجھتے تھے اور اس کے مطابق اپنی سیاسی بساط بچھاتے تھے۔ شروع دن سے ہی انھوں نے اس راز کو پا لیا تھا کہ اس عوام میں مقبول ہونے اور ان کے ذریعے اسمبلی تک پہنچنے کے لیے ہاتھ میں پیسہ چاہیے یا عوام سے تعلق۔ پیسہ ان کے پاس تھا نہیں اس لیے انھوں نے سماج کے مزاج کو دیکھتے ہوئے دوسرا راستہ اختیار کیا اور خود کو عوام میں رکھ کر عوام سے تعلقات بڑھانے شروع کر دیئے وہ یہ کام مستقل بنیادوں پر کرتے تھے اور لوگوں سے میل جول کو برابر آگے بڑھاتے رہے ان کا مطمع نظر سیاست کا میدان کارزار اور اس میں کامیابی حاصل کرنا تھا اس لیے انھوں نے خود کو کس حد تک سماجی کارکن کے طور پر پیش کیا اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

"میری سب سے بڑی خواہش راولپنڈی سے اسمبلی میں پہنچنا تھی اس کے لیے میں صبح ظہور کے والد بابو جی کے تھڑے پر ناشتہ کرتا دوپہر کو حاجی ہوٹل کالج روڈ پر کھانا کھاتا اور شام کو ہفتے میں ایک دن دلبر ہوٹل پر کھانا کھانے جاتا اور شام کو یامین کی دکان پر دودھ پینے بھی۔ ان سب کا فائدہ اور مقصد لوگوں کے قریب پہنچنا تھا۔"(۱۱)

یوں ظاہر ہوتا ہے کہ سماج میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے کوئی شخص خواہ کسی بھی سطح کا کیوں نہ ہو اسے سماج کے لوگوں سے تعلقات استوار کرنا پڑتے ہیں۔ اسے ان کے لیے وقت نکالنا پڑتا ہے۔ پھر کہیں جاکر اسے ان سے آشنائی ہوتی ہے جس کے بعد اگلا مرحلہ یہ آتا ہے کہ لوگ اس پر اعتماد کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اس حد تک اس کی عزت کرتے ہیں کہ اس کی ہر آواز پر لبیک کہنے لگتے ہیں۔ شیخ رشید احمد کی خود نوشت "فرزند پاکستان" میں اس اہم سماجی نکتے کو بڑی وضاحت سے اجاگر کیا گیا ہے۔ سماج کے لوگوں کی ہمدردیاں اور اعتماد حاصل کرنے کے لیے شیخ رشید احمد نے خود کو سماج کے لیے وقف کر دیا اس طرح وہ اپنے مقصد کے حصول میں کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔

پاکستانی سماج میں بہت سے ایسے واقعات بھی ہوئے ہیں جو بہت بڑی تحریک کا باعث بننے میں اور پھر یہ تحریکیں کامیابی سے ہمکنار بھی ہوئی ہیں۔ ایسے ہی واقعات میں سے قادیانی اور احمدی لوگوں کی شر انگیزیاں بھی ہیں جن کے مقابلے میں ختم نبوتؐ کی تحریک چلی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک میں پھیل گئی۔ اس تحریک نے اس قدر پذیرائی اختیار کی کہ آخر پاکستان کی قومی اسمبلی کو باضابطہ طور پر قادیانی اور احمدی فرقہ کے لوگوں کو ختم نبوت کا منکر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دینا پڑا۔ شیخ رشید احمد نے اس تحریک کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس تحریک کا حال بیان کرتے ہوئے شیخ رشید احمد لکھتے ہیں:

"اس زمانے میں تحریک ختم نبوتؐ شروع ہوئی۔ قادیانیوں کا بل جب اسمبلی میں پیش ہوا تو طلباء تاجر اور علماء نے مل کر ایک کمیٹی بنائی۔ اگر میں یہاں دارالعلوم تعلیم القرآن کے شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان کا ذکر نہ کروں تو زیادتی ہو گی وہ راولپنڈی

کی ہر سیاسی اور مذہبی تحریک میں خواہ تحریک ان کے مذہبی عقائد کے خلاف ہی کیوں نہ ہو ضرور شامل ہوتے تھے۔۔ ختم نبوتؐ کی تحریک میں راجہ بازار سے گرفتاریاں شروع ہوئیں تو قریباً چالیس حضرات کو پنڈی جیل کی بیرک میں بند کر دیا گیا۔" (۱۲)

شیخ رشید احمد نے "فرزند پاکستان" میں اپنی سیاست کے عروج وزوال کا بیان کرنے کے ساتھ سماج میں سیاسی شعور کو بھی واضح کیا ہے۔ سیاست دانوں کے جلسوں سے لے کر ایوان اقتدار تک اور محلاتی سازشوں تک سب کچھ اس خود نوشت میں ملتا ہے۔ انھوں نے سیاسی جلسوں کو سماجی تناظر میں دکھایا ہے کہ سماج کے لوگ کس طرح ان جلسوں میں حصہ لیتے تھے اور کس انداز میں اپنے سماجی حقوق کے حصول کے لیے سیاست کا سہارا لیتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان اجتماعات کو ناکام بنانے کے لیے مخالفین کی طرف سے جو ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے تھے "فرزند پاکستان" میں اُن کی بخوبی عکاسی ہوتی ہے۔ انہی ہتھکنڈوں میں سے ایک اہم واقعہ لیاقت باغ میں بھی برتا گیا خون ریزی سے بھی گریز نہ کیا۔ اس واقعے کا احوال شیخ رشید احمد یوں بیان کرتے ہیں:

"نمازِ جمعہ کے بعد لیاقت باغ میں لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ گئے جب جلسہ شروع ہونے والا تھا تو جلسہ گاہ کے عقب میں واقعہ لیاقت میموریل ہال سے اچانک گولیاں چلنا شروع ہو گئیں ۔ ریوالوروں ، پستولوں اور سٹین گنوں کی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ اس کے باوجود اپوزیشن میں شامل ہر جماعت کے لیڈر سٹیج پر آتے رہے اور یہ اعلان کرتے رہے کہ گولیا چلتی رہیں گی لیکن کاروان جمہوریت آگے بڑھتا رہے گا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ آرام سے بیٹھے رہیں۔ اس پر جلسہ گاہ میں " لاٹھی گولی کی سرکار نہیں چلے گی" کے نعرے بلند ہوئے۔" (۱۳)

ایسے واقعات پاکستانی سماج اور سیاست کے ماتھے پر سیاہ داغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان واقعات میں اقتدار کی ہوس رکھنے والوں نے بے گناہ انسانیت کا خون کیا۔ یہ خون اتنا ارزاں نہ تھا کہ بھلا دیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے واقعات سماج پر گہرے اثرات مرتب کرتے آئے ہیں۔ ان واقعات کے بعد ایک خوف وہراس

کی فضا پیدا ہوتی ہے تو دوسری طرف سماج میں بغاوت کے عناصر پہلے سے بھی زیادہ غم و غصہ کے ساتھ ابھرنے لگتے ہیں۔ شیخ رشید احمد نے ''فرزندِ پاکستان'' میں وہ تمام سماجی روّیے بھی بیان کیے ہیں جو ایسے واقعات کے بعد سماج میں پروان چڑھتے ہیں۔

اس کی بڑی وجہ شیخ رشید احمد کا عوام سے گہرا رابطہ ہے وہ ایسے واقعات سے ڈرنے اور جھکنے والے نہیں بلکہ ان کی سیاسی زندگی میں جب بھی کوئی ایسا سانحہ رونما ہوا وہ پہلے سے بڑھ کر جوش و جذبے کے ساتھ میدان کارزار میں نکلے اور اپنے حامیوں کو بھی نکالنے میں کامیاب رہے۔ یہی ان کی سیاست کا اصل محور تھا کہ وہ سماج اور عوام سے تعلق مضبوط رکھتے تھے۔ عوام کو ان پر جو اعتماد تھا اس کے پیچھے بھی شیخ رشید احمد کی سماجی فلاح و بہبود کی فکر تھی یہ سماجی فلاح و بہبود محض لوگوں کی گلیوں اور سڑکوں کو پختہ کروانے تک محدود نہ تھی بلکہ وہ سماج کے ہر شخص کو اس کے بنیادی حقوق کی آگاہی دلاتے اور ان بنیادی اور سماجی حقوق کے حصول کے لیے میدان عمل میں نکلنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ یہی ان کی سیاست میں کامیابی کا اصل راز ہے۔ سماج میں سے ان کی سیاست پروان چڑھی اور سماجی رویوں سے ہی ان کی فکر نے جلا پائی ہے۔

پاکستانی سیاست کا یہ المیہ رہا ہے کہ عوام کی رائے کے نام پر اربوں روپے خرچ کر کے انتخابات کروائے جاتے ہیں لیکن عوام کی رائے کو روندتے ہوئے غیر جمہوری ہتھکنڈوں اور دھاندلی سے حکومتیں بنائی جاتی ہیں۔ ایسے واقعات جہاں ایک طرف سیاست کو پراگندہ کرتے ہیں وہیں سماجی سطح پر عوام میں بھی نفرت بڑھنے لگتی ہے اور اگر اس دوران میں عوام کی رہنمائی کرنے والا کوئی معتبر اور مخلص شخص موجود ہو تو عوام سراپا احتجاج بھی بن جاتی ہے۔ یہ احتجاج سماجی سطح سے اٹھتا ہے اور تحریک میں تبدیل ہو کر اقتدار کے ایوانوں سے ٹکرانے لگتا ہے۔ شیخ رشید احمد ایسی ہی ایک عوامی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''انتخابات کے نتائج میں زبردست دھاندلی کی گئی اور بھٹو نے اپنی مرضی کے نتائج حاصل کر لیے۔ ملک سراپا احتجاج بن گیا اور اپوزیشن نے صوبائی اسمبلی کے انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کیا جس کا زبردست ردعمل ہوا۔ پولنگ اسٹیشن پر الو بولتے رہے اور اپوزیشن کی بہت بڑی اخلاقی فتح ہوئی۔ اپوزیشن کی کال پر ملک میں زبردست تحریک چلی جس میں بھٹو کا اقتدار ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا۔'' (۱۴)

ایسی تحریکوں کا سماج پر خاصا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عوام اپنے بنیادی حقوق کا حصول اور سماج میں بہتری اور خوش حالی کی خواہش مند ہوتی ہے اسی خواہش کو سامنے رکھتے ہوئے اکثریت ایسے لوگوں کو ووٹ دیتی ہے جو ان کے حقوق کے حصول کے لیے اقتدار کے ایوانوں میں آواز بلند کر سکیں۔ لیکن جب عوام کو اپنی رائے کی پامالی اور اپنے ووٹ کی بے حرمتی ہوتی نظر آتی ہے تو نفرت اور غصے کا لاوا پکنے میں دیر نہیں لگتی یہی صورت حال سماج سے ابھر کر سیاست میں ہلچل پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔

سیاست کے ساتھ ساتھ شیخ رشید احمد نے کاروبار میں بھی خوب محنت کی اور انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں شروع کیے گئے کاروبار کو اپنی محنت اور ذہانت کے بل بوتے پر عالمی سطح کی کمپنیوں تک لے کر گئے۔ اس سے جہاں ان کی اقتصادی حالت میں بہتر آئی وہیں سماجی مرتبے میں بھی اضافہ ہوا۔ شیخ رشید احمد نے سیاسی زندگی کے حوالے سے سماجی عکاسی کے ساتھ ساتھ ''فرزندِ پاکستان'' میں سماج میں کاروباری طبقے اور سرمایہ دار کے طریقوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

مثل مشہور ہے کہ '' پیسہ پیسے کو کھینچتا ہے'' کاروبار میں یہی اصول چلتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جس کاروباری شخصیت نے جتنی بڑی کسی کمپنی سے معاہدہ کر کے اپنے کاروبار کو وسعت دینا ہوتی ہے اسے اس کمپنی اور اس سے وابستہ لوگوں کے سامنے خود کو ان کے برابر کا بنا کر پیش کرنا ہوتا ہے۔ یہ سماج میں کاروباری طبقے کے لیے ایک نہایت ضروری عنصر بن چکا ہے کسی کمپنی کی مصنوعات خواہ کتنی ہی اعلیٰ درجے کی کیوں نہ ہوں جب تک ان کو متعارف کروانے والے لوگ دوسروں کے مقابلے میں آکر اپنی سماجی اور کاروباری حیثیت کی برتری ثابت نہ کریں اس کمپنی کی مصنوعات زوال پذیر ہونے لگتی ہیں۔ شیخ رشید احمد نے جب قالینوں کے کاروبار میں ہاتھ ڈالا تو اس کاروباری اصول کو خاص طور پر مد نظر رکھا کہ سماجی حیثیت اور کاروباری شخصیت کے طور پر خود کو عالمی سطح کے ڈائریکٹرز اور دیگر کاروباری لوگوں جیسا بنا کر پیش کرنا ہے۔ اس کی عکاسی فرزند پاکستان میں کئی جگہوں پر ہوتی ہے وضاحت کے لیے ''فرزند پاکستان'' سے ایک مثال دیکھیے:

”میں جاپان پہنچا تو مسٹر کم کو فون کیا کہ چلو دیکھتا ہوں کیا ہوتا ہے۔ مسٹر کم کوریا میں تھے میں نے رہائش پہلے یوتھ ہوسٹل میں رکھی تھی لیکن میں نے اندازہ لگا لیا کہ اس طرح بزنس مین حضرات سے میرا رابطہ نہیں ہو سکے گا۔ جب وہ رابطے کا پوچھتے تو یوتھ ہوسٹل سے سارا امیج خراب ہوتا لہٰذا میں ہوسٹل سے شم بالشی ڈاپچی ہوٹل میں شفٹ ہو گیا یہ ایک سستا اور نسبتاً بہتر ہوٹل تھا۔“ (۱۵)

اس سے سماجی طبقے کے طرز عمل کی عکاسی ہوتی ہے جو کاروبار سے وابستہ ہے۔ ان کے نزدیک کاروباری معاملات برابر کی سطح پر طے کیے جانے چاہئیں۔ اس لیے دونوں کاروباری پارٹیاں اپنے آپ کو بہتر بنا کر دوسرے کے سامنے پیش کرنے کی کوشش میں رہتی ہیں۔ سماج پر اس صورت حال کے بعض اوقات منفی اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں ایسی صورت حال میں جب ظاہری چمک دمک سے متاثر ہو کر کاروباری معاہدے کیے جاتے ہیں تو کاروباری طبقہ اور سرمایہ دار اپنے سرمائے میں اضافے کے جتن تو کرتا ہے لیکن وہ عوام جو ان کے سرمائے سے لگائے گئے کاروبار میں محنت کر کے اس کے کاروبار اور سرمائے کو وسیع کر رہے ہوتے ہیں ان کے مفادات کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ایسی صورت حال میں سرمایہ حیثیت جاتا ہے جب کہ محنت ہار جاتی ہے یہ ایسا سماجی المیہ ہے کہ جو سماج کی غالب اکثریت کو دیمک کی طرح چاٹتا چلا جاتا ہے۔ سرمایہ وارثت نئے حیلوں اور اشتہاری مہم کے ذریعے اپنے کاروبار اور سرمائے کو تو بام عروج تک لے جا رہا ہے لیکن اس کاروبار سے وابستہ مزدوروں کی حالت بدلنے پر نہیں آتی۔

سماجی حوالے سے سماج مین بعض ایسی رسومات اور رواج بھی پائے جاتے ہیں جن سے کنارہ کشی اگر اختیار کر لی جائے تو سماج میں بہتری کے ساتھ ساتھ بہت سے اخراجات بھی بچا جا سکتا ہے اور یہ رقم جو ان رسومات یا رواجوں کی مد میں جاتی ہے اسے کسی مفید کام پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔ ایسی ہی رسومات میں ایک رسم حج یا عمرہ کی ادائیگی کے وقت لوگوں کا اجتماع بھی ہے ایسے اجتماعات اب سماج میں عام ہوتے جا رہے ہیں۔ شیخ رشید احمد کے خیال میں ایسے اجتماعات میں جو فضول خرچی ہوتی ہے وہ کسی صورت بھی لائق ستائش نہیں ہے۔ اپنے حج کے سفر پر روانگی کا حال بیان کرتے ہوئے شیخ رشید احمد اس سماجی روش کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ” حج پر روانگی اور آمد کو میں نے بہت خفیہ رکھا حتیٰ کہ میرے گھر والے بھی اس وقت حیران ہوگئے جب میں نے انہیں بتایا کہ میں حج کو جارہا ہوں۔ یہ ان کے لیے حیران کن بات تھی کیونکہ میں نے روانگی سے دو گھنٹے پہلے اطلاع دی تھی۔ میرے نزدیک رشتہ داروں کے حج کا الوداعی اور مبارک بادی اخراجات حج کے اخراجات سے کہیں زیادہ تھے اور میں آج بھی اس رسم کے خلاف ہوں کہ غریب کا ایک دینی فریضہ ادا کرنے پر جتنا خرچ اٹھتا ہے اس سے کہیں زیادہ اس کے رشتہ دار دعوتوں اور تحائف کی امید سے اسے لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔“ (١٦)

یہ ہمارے سماج میں روز بروز مضبوط ہوتی رسم ہے۔ مبارکباد اور دعوت تو اپنی جگہ درست ہے لیکن جو نمود و نمائش اس کی آڑ میں رواج پاتی جارہی ہے وہ کسی صورت بھی قابل ستائش نہیں ہے۔ امیر لوگ تو پھر بھی ان رسومات کے اخراجات پورے کر لیتے ہیں لیکن ان کی دیکھا دیکھی وہ غریب طبقہ جس نے حج یا عمرہ کے لیے اپنی زندگی کی کل جمع پونجی خرچ کر کے ان اہم فرائض کی ادائیگی کی ہوتی ہے وہ ان رسومات میں پڑ کر مقروض ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہیں سے سماجی الیے جنم لیتے ہیں۔ ہمارے سماج میں یہ رسومات اور نمود و نمائش غریب اور سفید پوش طبقے کے لیے بہت سے مسائل پیدا کر رہی ہیں۔ شادی بیاہ، فوتگی اور دیگر سماجی اجتماعات پر ہونے والی یہ رسومات اخراجات کے حوالے سے غریب اور متوسط طبقے کو مسائل کی دلدلوں میں دھکیلتے جارہے ہیں۔ شیخ رشید احمد نے اپنے حج کے سفر کے ذکر سے اس بارے میں ایک مثال پیش کر کے اس سماجی روش کی عکاسی کی ہے کہ حج کے اخراجات سے زیادہ لوگ ان رسومات پر خرچ کر دیتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کے نزدیک سادگی زیادہ بہتر ہے۔ یہی سادگی سماجی بہتری اور کفایت شعاری میں بھی معاون ثابت ہوتی ہے۔

سماج کی تشکیل مختلف طبقات کے ملنے سے ہوتی ہے۔ اس میں غریب، امیر، جاگیردار، سرمایہ دار، سیاست دان، مزدور اور دیگر بہت سے طبقات شامل ہوتے ہیں۔ ان تمام طبقات کے ملنے سے سماج کی تشکیل ہوتی ہے اور سماج کی بہتری، ترقی اور خوش حالی میں ان تمام طبقات کا اہم کردار ہوتا ہے جس سماج کے یہ

طبقات اپنے فرائض ایمانداری سے بطریق احسن انجام دیتے رہتے ہیں اور غفلت کے مرتکب نہیں ہوتے وہ سماج ان کی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جس سماج کے ان طبقات میں سے ایک یا چند اپنے فرائض سے غفلت اختیار کرتے ہیں وہ سماج زوال کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔

اس تناظر میں پاکستانی سماج کو دیکھا جائے تو بہترین جغرافیائی اہمیت اور وسیع وسائل کا حامل یہ ملک گوناں گوں مسائل کا شکار ہے۔ اس کی بڑی وجہ وہ غفلت، سہل پسندی اور کام چوری ہے جو اس سماج کے باشندوں میں رائج ہو چکی ہے۔ ایوان اقتدار میں عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والا سیاست دان طبقہ انتخابی مہم کے دوران بلند و بانگ دعوے کرتا نظر آتا ہے اور عوام کے مسائل کو اسمبلی میں اٹھانے اور ان کے حل کے لیے اپنی توانائیاں صرف کرنے کے وعدے کرتا ہے لیکن اسمبلی میں پہنچنے کے بعد سماج کے اس اہم طبقے کا طرزِ عمل کیا ہوتا ہے شیخ رشید احمد اس بارے میں لکھتے ہیں:

> "چار منتخب اسمبلیوں میں نوے فی صد اسمبلی ممبران ایسے دیکھے ہیں جنھوں نے کبھی اٹھ کر یہ بھی نہ کہا کہ ائیر کنڈیشنڈ ہلکا کر دو سردی لگ رہی ہے اور شاید ایک بڑی تعداد نے کبھی پوائنٹ آف آرڈر پر کھڑا ہونا بھی گوارا نہیں کیا۔ اسمبلیوں میں ان ممبران کی تعداد بھی کم نہیں جن کا مطمحِ نظر فقط اسمبلیوں میں بیٹھ کر اپنے سرکاری اور غیر سرکاری رشتہ داروں کی ملازمتوں کو ان کی خواہشوں کے مطابق تعیناتی اور ان کے مفادات کی نگہداشت ہے۔" (۱۷)

ذاتی مفادات کا حصول اور اقربا پروری ایسے ناسور ہیں جو اس سماج کو آگے بڑھنے سے روکے ہوئے ہیں۔ یہ منفی عناصر جو ایوان اقتدار میں عوام کے ووٹوں سے پہنچے ہوتے ہیں وہاں پہنچ کر عوام کے مسائل سے بالکل بے بہرہ ہو جاتے ہیں ان کے نزدیک عوام کی ضرورت فقط انتخابات تک تھی اور اگلے انتخابات میں وہ ایک بار پھر دعوؤں کے زور اور امیدوں کے نئے سبز باغ دکھا کر عوام کے ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں یوں سماج میں ان ہی کی وجہ سے ذاتی مفادات کی جنگ، اقربا پروری اور اس طرح کی

دیگر منفی روشیں پروان چڑھتی چلی جاتی ہیں جن کے نتیجے میں صاحبان اقتدار اور ارباب سیاست تو اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے چلے جاتے ہیں لیکن عوام کی حالت سدھرنے میں نہیں آتی ان کے مسائل جوں کے توں ہی رہتے ہیں اور وہ ان مسائل کی چکی میں پستے چلے جاتے ہیں۔ شیخ رشید احمد کی اس خودنوشت میں اہم سماجی طبقے یعنی سیاست دانوں کے عوام کو دیئے گئے دھوکوں اور دوغلے پن کی خوب عکاسی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ شیخ رشید احمد کا نقطہ نظر یہ ہے کہ عوام کے مسائل صرف اسی صورت میں حل ہو سکتے ہیں جب عوام کے ایسے حقیقی نمائندے اسمبلیوں میں پہنچیں جنہیں ان مسائل کا سامنا بھی ہو ان کا ادراک بھی۔ شیخ رشید احمد لکھتے ہیں:

> " چار اسمبلیوں کے ممبر منتخب ہونے کے بعد اور ان کی کارکردگی کا بغور جائزہ لینے کے بعد میری یہ ذاتی رائے ہے کہ ہمیں اپنے نظام کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے۔ جب تک وہ لوگ اسمبلیوں میں نہیں آئیں گے جن کے گھروں میں مسئلے ہیں اس وقت تک اس ملک کے مسائل حل نہیں ہو سکیں گے ورنہ یہ اسمبلیاں ڈبٹینگ کلب بن کر رہ جائیں گی۔ اور کوئی خدمت انجام نہ دے سکیں گی۔" (۱۸)

شیخ رشید احمد کے سماجی شعور کو دیکھا جائے تو وہ معاشرے کے نچلے اور پسے ہوئے طبقے کے ترجمان کے طور پر متعارف ہوئے۔ جو نا صرف ان مسائل سے آگاہ ہیں۔ بلکہ نفسیاتی پہلو سے بھی واقف حال ہیں۔ شیخ رشید احمد کو بچپن سے ہی لوگوں کے ساتھ مضبوط سماجی تعلقات قائم کرنے کا فن آتا تھا۔ انھوں نے اپنے سکول اور کالج کے زمانے میں بھی سماجی تعلقات کو ہمیشہ فوقیت دی۔ کالج کے زمانے میں ان کے سماجی شعور میں پختگی آچکی تھی اور راولپنڈی کے سماجی ڈھانچے کو بہتر طور پر سمجھنے کی وجہ سے بہت جلد کالج میں نمایاں ترین سرگرم طالب علموں میں شامل ہو گئے جنہیں نا صرف لوگوں کو گرویدہ بنانا آتا تھا۔ بلکہ ان کی دلی خواہشات کو الفاظ میں بیان کرنے کا ملکہ بھی رکھتے تھے۔

شیخ رشید احمد کو راولپنڈی کے دوسرے سیاست دانوں پر اس لیے فوقیت حاصل ہے کیونکہ وہ راولپنڈی کے سماجی حالات وواقعات سے دوسرے رہنماؤں کی نسبت کہیں زیادہ واقف اور باخبر رہتے ہیں۔

## ج: عبد المجید ملک کی آپ بیتی "ہم بھی وہاں موجود تھے" میں سماجی شعور:

عبد المجید ملک کا شمار پاکستان کے معروف فوجی افسران اور سیاست دانوں میں ہوتا ہے۔ چکوال سے تعلق رکھنے والے دھرتی کے اس عظیم سپوت نے نہ صرف اپنی فوجی زندگی میں بے شمار کارہائے نمایاں انجام دیئے بلکہ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد سیاست کے میدان کارزار میں قدم رکھا تو اپنی فہم و فراست اور بہترین منصوبہ بندی سے بہت سی قدر آور سیاسی شخصیات کو شکست دی۔ ان کا شمار چکوال کے معززین میں ہوتا ہے۔ فکر و عمل کی پیکر یہ شخصیت اعلیٰ ادبی ذوق کی بھی حامل ہے۔

" ہم بھی وہاں موجود تھے" عبد المجید ملک کی خود نوشت ہے۔ اس خود نوشت میں انھوں نے نہ صرف اپنے حالات زندگی تحریر کیے ہیں بلکہ اپنے عہد کی سیاسی اور سماجی صورت کا تذکرہ بھی بڑی تفصیل سے کیا ہے۔

عبد المجید ملک کی پیدائش ۱۹۱۹ء میں ہوئی۔ یوں اس آپ بیتی کا آغاز بھی اس سال سے ہوتا ہے۔ یہ عرصہ دنیا بھر میں خاصا ہنگامہ خیز شمار ہوتا ہے۔ ایک طرف جنگ عظیم اوّل کے اثرات واضح تھے تو دوسری طرف انقلاب روس کی صورت میں سوشلزم اپنی ترقی کی منازل طے کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ زندگی اصل صورت حال خاص طور پر دیہی علاقوں کے رسم و رواج بھی پروان چڑھ رہے تھے۔

سیاسی حوالے سے دیکھا جائے تو سیاسی سطح پر بھی اس دور میں خاصی گہما گہمی پائی جاتی ہے۔ برصغیر کی انگریزوں سے آزادی کی تحریک خاصے زور و شور سے جاری تھیں اور اپنی منزل کو بڑھ رہی تھیں۔ ان حالات میں عبد المجید ملک نے جنم لیا۔ گویا ان کی زندگی کا بچپن اور جوانی ان سیاسی اور سماجی حالات میں گزرا جو خاصے ہنگامہ خیز تھے تو ان حالات نے ان کی شخصیت پر بھی گہرا اثر ڈالا۔

عبد المجید ملک کا تعلق سپاہ گر گھرانے سے ہے۔ ان کے والد بھی فوج میں اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ خود عبد المجید ملک پہلے سپاہی کلرک بھرتی ہوئے اور بعد میں کمیشن میں منتخب ہو کر آفیسر بنے انھوں نے انتہائی غیر جانب داری سے حقائق کو بیان کرتے ہوئے اپنی خود نوشت میں جہاں فوج میں اپنی آفیسری کے دور کے کارنامے اور حالات بیان کیے ہیں وہاں اپنی بطور سپاہی تعیناتی کے دور کے حالات کو بھی بیان کیا ہے۔

”ہم بھی وہاں موجود تھے“ کا زیادہ حصہ عبدالمجید ملک کی سپاہیانہ اور سیاسی زندگی کے نشیب و فراز پر مشتمل ہے۔ سپاہیانہ زندگی میں مختلف لوگوں سے میل جول، عوام کے دل میں فوج کی اہمیت، پیشہ ورانہ کارکردگی کا بیان کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی سیاسی زندگی کو بھی تفصیل سے اس آپ بیتی میں بیان کیا ہے۔ سیاسی حالات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے پاکستان کے سیاسی انتخاب حکومتوں کا بننا اور ٹوٹنا، صدر اور وزیر اعظم کے اختلافات اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں جمہوریت کے نقصان سمیت ملک میں مارشل لاء کے لگنے اور اس کے اثرات کا بخوبی بیان کیا ہے۔

عبدالمجید ملک نے ایک بھرپور سپاہیانہ اور سیاسی زندگی گزاری۔ پاکستان میں اقتدار کے ایوانوں کے احوال کا جائزہ لیا جائے تو سیاست دانوں کے ساتھ ساتھ اقتدار فوجی جرنیلوں کے ہاتھ بھی رہا۔ بلکہ زیادہ عرصہ مارشل لاء کے ماتحت ہی گزرا۔ عبدالمجید ملک کو دونوں طرح کے اقتدار کے حوالے سے ذاتی تجربہ تھا۔ وہ اس دوران میں فوج میں بھی اعلیٰ عہدے پر رہے اور بعد ازاں سیاست میں شامل ہو کر بھی اقتدار کے ایوانوں تک پہنچے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اس آپ بیتی میں پاکستان کی سیاسی تاریخ کی پوری کہانی ملتی ہے۔

سماجی حوالے سے دیکھا جائے تو عبدالمجید ملک کی آپ بیتی جس عہد کا احاطہ کرتی ہے سماجی حوالے سے بھی اس دور کی اپنی اہمیت ہے۔ اس دور میں بعض ایسے واقعات رونما ہوئے جنھوں نے برصغیر کے سماجی منظر نامے کو خاص طور پر متاثر کیا تھا۔ قیام پاکستان کے لیے مسلمانوں کی کوشش، قیام پاکستان کے وقت ہجرت اور ہجرت کے مسائل، مہاجرین کی آباد کاری، ہندوؤں کا تعصب پر مبنی روّیہ اور اس روّیے کی وجہ سے لڑی جانے والی جنگیں، ملک میں مارشل لاء کا لگنا اور دیگر بہت سے ایسے واقعات ہیں جنھوں نے سماجی منظر نامے میں خاص تحرک پیدا کیے۔

عبدالمجید ملک کی اس آپ بیتی ”ہم بھی وہاں موجود تھے“ کا جب ہم سماجی تناظر میں مطالعہ کرتے ہیں اور ان کے سماجی شعور تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے قیام پاکستان سے قبل کے سماجی منظر کو بھی بڑی تفصیل کے ساتھ اس آپ بیتی میں بیان کیا ہے۔

عبد المجید ملک کا تعلق جس علاقے سے تھا وہ زیادہ تر اعوان خاندان پر مشتمل تھا۔ یہ خاندان برصغیر کی تاریخ میں اپنی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ سماجی حوالے سے اس خاندان کی اپنی خاص روایات ہیں جو اس کا امتیازی وصف بن کر ابھری ہیں۔ اعوانوں کے اس علاقے کی تصویر کشی عبد المجید ملک یوں بیان کرتے ہیں:

> ''اس دور کے جند اعوان کی تصویر ایک برساتی نالے کے کنارے، ایک بلند ٹیلے پر واقع کچے مکانوں پر مشتمل ایک گاؤں کی صورت میں میرے حافظے میں بد ستور محفوظ ہے۔ یہاں اعوان قبیلے کی چار برادریاں موجود تھیں جن کا ذریعہ معاش کاشت کاری تھا۔ اس گاؤں کے بہت ہی کم افراد ملازم پیشہ تھے۔ ان سب کے مزاج میں اس علاقے کی دھوپ چھاؤں اور سردی گرمی کے تمام موسموں کا رنگ رچ بس گیا تھا۔ کبھی وہ ایک دوسرے سے دوستی نبھاتے تو کبھی ان کی باہمی رقابتیں، برتری اور قیادت کی جنگ اور زمین کے جھگڑے ان کو ہسپتال، تھانہ، کچہری، عدالت تک لے جاتے۔'' (۱۹)

سماجی سطح پر مختلف لوگوں میں پائی جانے والی موافقت اور مخالفت کے اس بیان میں گہرا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ موسموں کی طرح مزاج ان لوگوں کے عکاس ہوتے ہیں جن کے نزدیک اپنی خاندانی جاہ و جلال اور وقار کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ جہاں کہیں بھی ان پر زک پڑتی نظر آتی ہے۔ ان لوگوں کے مزاج اور روّیے بدلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ عبد المجید ملک جس دور کی اور جس خاندان کی عکاسی کر رہے ہیں برصغیر کے سماجی منظر نامے پر وہ دور اور وہ خاندان دونوں ہی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے دوستی نبھانے اور لڑائی جھگڑے کی صورت میں تھانہ کچہری اور عدالت تک جانے کا بیان کر رہے اس عہد کی سماجی حالت کو بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس امر کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ ان کے ہاں لڑائی جھگڑے اور تنازعات زیادہ تر زمین کی وجہ سے پیدا ہوتے تھے۔

قیام پاکستان سے قبل برصغیر کے مختلف علاقوں میں ہندو، مسلمان اور سکھ تینوں قومیں آباد تھیں۔ یہ لوگ آپس میں باہمی دوستی کے رشتے میں بندے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کے لیے دل میں خاص محبت رکھتے تھے۔

عبد المجید ملک نے قیام پاکستان سے قبل ان تینوں اقوام کے سماجی تعلقات کی عکاسی یوں کی ہے۔

> ''ہمارے گاؤں میں ہندو آباد تھے ان میں سے دمودر داس ایک ہندو ہمارے پڑوس میں رہائش پذیر تھا اس دور میں غیر مسلم خاندانوں کے ساتھ مسلمانوں کے سماجی تعلقات نہایت خوشگوار ہوتے تھے۔ کسی قسم کا تعصب یا تنگ نظری ان تعلقات میں حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ دمودر داس کی گاؤں میں ایک دکان تھی جس سے گاؤں کے لوگ روز مرہ کی اشیاء خریدتے تھے۔''(۲۰)

ان لوگوں کے دل میں ایک دوسرے کے لیے گہری ہمدردیاں ہوتی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے اور خوشی سے ایک دوسرے کے دکھ درد بھی بانٹتے تھے۔ قیام پاکستان سے قبل کا سماجی منظر نامہ دیکھا جائے تو وہ علاقہ جو اب پاکستان پر مشتمل ہے یہاں بھی ہندو اور سکھ لوگ آباد تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں کا زیادہ تر پیشہ تجارت اور دکانداری ہوتا تھا۔ دکاندار اور تاجر پیشہ لوگ معاشرے کا اہم حصہ ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرے کے لوگوں سے گہرے سماجی روابط میں بھی بندھے ہوئے ہیں اور لوگوں کے ساتھ لین دین میں ان کے لوگوں کے ساتھ رابطے اور تعلقات مزید مستحکم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایسی ہی صورت حال قیام پاکستان سے قبل اس خطے میں بھی سماجی حوالے سے دیکھی جا سکتی ہے۔ اس عہد کے لوگ ایک دوسرے کے لیے دل میں تعصب، تنگ نظری اور نفرت کی بجائے محبت، ہمدردی اور باہمی سماجی رشتے رکھتے تھے۔ یہ رشتے وسعت قلبی کو ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ سماجی منظر نامے کو خوب صورت بھی بناتے تھے۔ عبد المجید ملک نے اپنی آپ بیتی میں ان سماجی رشتوں کی بھی بڑی خوب صورتی سے عکاسی کی ہے۔ انھوں نے انتہائی غیر جانب داری کے ساتھ جہاں کہیں ہندوؤں اور سکھوں کی سماجی منظر نامے کی بہتری کے لیے خدمات سامنے آئیں وہ بیان کر دی ہیں۔

برصغیر کے سماجی منظر نامے پر نگاہ دوڑائی جائے تو سماجی اور اخلاقی روایات کی تشکیل میں مذہب کا گہرا عمل دخل نظر آتا ہے۔ مذہب کے زیر اثر لوگ اپنی حاجات پوری کرنے کے لیے مختلف بزرگوں اور درباروں پر حاضری دیتے ہیں اور ان دربارون کی خدمت مختلف طریقے سے کرنے کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے ہیں۔ عبد المجید ملک کی آپ بیتی میں اس سماجی عنصر کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

"مسجد میں تیل کے چراغ روشن ہوتے۔ گاؤں کی خواتین کسی مشکل اور مصیبت
کے وقت اپنے سروں پر پانی کے گھڑے اٹھا کر مسجد کے مٹکے میں پانی بھر تیں۔ ان
کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور ثواب حاصل کرنے کا یہ ایک مناسب ذریعہ
تھا۔ کچھ خواتین کسی آفت یا مصیبت میں کوئی منت مانتیں تو دور دراز کے دیہات مثلاً
سید کسراں اور پیر پھلاہی میں واقع مزارات پر پانی کے گھڑے گاؤں سے بھر کر لے
جاتیں اور درباروں کے مٹکوں میں ڈال کر آتیں۔" (۲۱)

مسجد اور دربار کے ساتھ عوام کا تعلق اس خطے کی مسلم ثقافت اور اسلامی اقدار کی وجہ سے خاصا گہرا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل کے سماجی منظر کو دیکھا جائے تو عوام میں اسلامی تعلیمات پر عمل ہو یا نہ ہو اسلامی شعائر اور اسلامی اقدار کی ان کے دل میں گہری عقیدت تھی اور یہ صورت حال آج بھی قائم ہے۔ آج بھی لوگ نماز روزے کے پابند ہوں یا نہ ہوں مذہب کے ساتھ گہری عقیدت اور وابستگی ضرور رکھتے ہیں۔ خاص طور پر بزرگان دین سے لوگوں کی عقیدت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ ان بزرگان دین نے برصغیر میں اسلام کی شمع روشن کرنے اور اسلامی تعلیمات کو لوگوں تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ سماجی منظر نامے کی اصلاح اسلامی خطوط پر کرنے کے حوالے سے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں کہ ان کا نام آج بھی نہ صرف زندہ ہے بلکہ لوگوں کے دلوں میں گہری عقیدت رکھتا ہے۔ لوگ آج بھی ان کے درباروں پر حاضری دیتے ہیں اور درباروں کی خدمت کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیتے بلکہ اپنے لیے اسے باعث سعادت سمجھتے ہیں۔

عبدالمجید ملک نے ان بزرگان دین کے ساتھ لوگوں کی عقیدت اور ان ہستیوں کے درباروں کے ساتھ لوگوں کی وابستگی کو بھی سماجی منظر نامے کے ساتھ اپنی آپ بیتی میں بیان کیا ہے۔

قیام پاکستان سے قبل برصغیر کے مختلف خطوں میں گھروں میں پینے کے پانی کے لیے نل وغیرہ کا انتظام نہیں ہوتا تھا۔ پانی کے لیے کنویں کھودے جاتے تھے اور وہیں سے پانی بھر کر لایا جاتا تھا۔ یہ کام عام طور پر عورتیں انجام دیتی تھیں۔ سماجی حوالے سے کنوؤں پر عورتوں کا ٹھ اپنی خاص اہمیت رکھتا تھا۔ عبدالمجید ملک لکھتے ہیں:

> "گاؤں کے ساتھ برساتی نالے کلھیاں کے اطراف میں متعدد کنوئیں تھے جن سے گاؤں کی خواتین گھڑے سر پر اٹھا کر صبح وشام تازہ پانی بھر کر لاتی تھیں۔ گاؤں کے اندر لوگوں کے گھروں میں پینے والے پانی کا نظام موجود نہیں تھا چنانچہ گاؤں کے افراد باربردار جانوروں پر گھڑے لاد کر بھی ان کنوؤں سے پانی بھر کر لاتے۔"(۲۲)

یہ اس دور کی کہانی ہے جب برصغیر کے ہر گھر میں پینے کا پانی میسر نہیں تھا۔ پانی میسر نہ ہونے کی وجہ سے پانی کی خرابی نہیں بلکہ نایابی تھی۔ گھروں میں زمین سے پانی نکالنے کا کوئی خاص انتظام نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے پانی کی فراہمی کے لیے کنوئیں کھودے جاتے تھے اور ان کنوؤں سے پورا علاقہ اپنے پینے اور دیگر ضروریات پوری کرنے کے لیے پانی بھرتا تھا۔

عبدالمجید ملک نے اپنی آپ بیتی میں برصغیر کے سماج کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ ان کے ذاتی تجربات کا مجموعہ ہے۔ آپ بیتی نگار اپنی سرگزشت ہی تو بیان کرتا ہے۔ سماج کے آپ بیتی نگار پر پڑنے والے اثرات اور پھر ان اثرات کی وجہ سے اس کے اعمال میں تبدیلی اور فکر میں تغیر یہ سب کچھ ایک آپ بیتی نگار کے لیے ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ عبدالمجید ملک کی آپ بیتی کو دیکھا جائے تو انھوں نے اپنے ذاتی تجربات بیان کرتے ہوئے برصغیر کے سماج کی عکاسی بھرپور طریقے سے کردی ہے۔

سکول جاتے بچوں کے لیے تفریح کے وقت کا کھانا ساتھ لے جانے کا رواج کافی پہلے کا چلا آرہا ہے۔ یہ رواج ماؤں کی بچوں سے والہانہ محبت کے ساتھ ساتھ سماجی صورت حال کو بھی واضح کرتا ہے۔ دیہاتی ماؤں کی صورت حال ملاحظہ ہو:

> "والدہ محترمہ کے بنائے ہوئے مکھن کے پراٹھے جو وہ مجھے سکول جاتے ہوئے ساتھ باندھ کر دیتی تھیں، پیدل سفر کے لیے توانائی مہیا کرتے۔ میری والدہ محترمہ بھی ان دیہاتی ماؤں میں سے ایک تھیں جو اپنے محدود علم اور وسائل کے باوجود اپنی ذہانت اور شفقت کی مدد سے اپنے بچوں کو کامیابی کے زینے پر پہنچا دیتی ہیں۔ ایسی ہزاروں ماؤں کی بے شمار داستانیں ہیں جن پر کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔"(۲۳)

عبد المجید ملک نے اپنی والدہ کے روپ میں برصغیر کے سماج کی ان ماؤں کی کامیاب تصویر کشی کی ہے جن کا مطمعِ نظر اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلوانا اور انھیں سماج کا ایک مفید شہری بنانا ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ماں سب تکالیف اور مشقتیں بھی برداشت کرتی ہے۔ وہ خود تو تعلیم سے دور رہی ہوتی ہیں لیکن ان کے ایک ہی لگن اور ایک ہی جستجو ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان کی اولاد بہتر تعلیم و تربیت حاصل کر سکے اور مفید کام انجام دینے کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی بہتر ہو سکے۔

کھیل اور کھیل کے میدانوں کو سماج میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ کھیل کے میدان جہاں کھیلوں کی سرگرمیوں کو پیش کرتے ہیں وہاں سماجی اجتماعات کا باعث بھی بنتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ جس سماج کے کھیل کے میدان آباد ہوتے ہیں اس سماج میں سماجی اقدار بھی مضبوط ہوتے ہیں۔ عبد المجید ملک اپنی آپ بیتی میں اس سماجی عنصر کی عکاسی یوں کرتے ہیں:

> ”یہ ۱۹۳۵ء کا زمانہ تھا جب چکوال شہر ایک نہایت مختصر اور چند گنے چنے قبیلوں پر مشتمل ایک بڑے قصبے کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ میرے سکول کے اطراف میں کھلے میدان پر کمیٹی کا میلہ منعقد ہوتا تھا۔ جس میں بیلوں کے جلسے ہوتے، دوڑیں اور مختلف کھیلوں کے مقابلے منعقد ہوتے تھے۔ سردار اشرف دلہہ کے والد کی گھوڑیاں نیزہ بازی اور اس میں بطور خاص شریک ہوتیں۔ ہم نے بارہا کبڈی کے معروف کھلاڑی عبداللہ عرف دلہہ چک ملوک کو اونٹ کے اوپر سے جمپ کرتے ہوئے دیکھا۔“(۲۴)

سماج میں کھیل کے نامور کھلاڑیوں کی خاص پذیرائی ہوتی تھی۔ اس دور میں کبڈی کا کھیل بہت مقبول تھا۔ یہ کھیل ذہانت کے ساتھ ساتھ جسمانی زور اور طاقت پر بھی خاصا انحصار کرتا ہے۔ اس کھیل کے نامور کھلاڑی پورے علاقے میں مشہور ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کھیل میں لگائے جانے والے مختلف داؤ پیچ بھی لوگوں کی زبان پر عام ہوتے ہیں اور لوگ بہت سے کھلاڑیوں کو انہی داؤ پیچوں سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ یہ کھیل سماجی حوالے سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ عبد المجید ملک نے اپنی آپ بیتی میں جہاں دیگر بہت سے سماجی امور بیان کیے ہیں وہاں انھوں نے کھیلوں کے حوالے سے بھی سماجی منظر نامے کی خوب عکاسی کی ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھی جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں نظر آتی ہے کہ مختلف ادوار میں مختلف علاقوں میں مسلمان خواہ سیاسی اور سماجی حوالے سے کمزور ہی کیوں نہ رہے ہوں۔ ان کی اقتصادی حالت دوسرے سے کم تر ہی کیوں نہ رہی ہو انھوں نے زندگی کی سہولیات اور ضروریات پر تو سمجھوتہ کیا ہے لیکن ایک کام نبی اکرم ﷺ کی حرمت اور تقدس کا ایسا ہے جس پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہ کیا گیا اور نہ کیا جائے گا۔ جس کسی نے بھی نبی مکرم ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخی کی اس کا انجام عبرت ناک ہوا۔ ایسا ہی ایک واقعہ برصغیر میں غازی علم الدین شہید کے ہاتھوں بھی رونما ہوا۔ ان کے بعد بھی شمعِ رسالت ؐ کے پروانے حرمت رسالت ﷺ پر کٹ مرتے رہے۔

غازی مرید حسین شہید کا تعلق بھی اسی سلسلے سے ہے جنھوں نے خود کو حرمت رسول ﷺ پر قربان کر دیا۔ اس قربانی سے بھی لوگوں کو گہری عقیدت تھی۔ سماج میں اس عقیدت کی عکاسی ملاحظہ ہو:

> ”غازی مرید حسین شہید کو ایک ایسے ہندو ڈاکٹر کو واصل جہنم کرنے پر پھانسی دی گئی جس نے حضور اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کی تھی۔ ان کی میت جب چکوال پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ غازی مرید حسین شہید کے جنازے کا منظر آج بھی میری نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ میں اپنے ہم جماعت دوستوں کے ساتھ سکول سے براستہ جہلم روڈ روانہ ہوا تو یوں محسوس ہوتا کہ جس طرح گرد و نواح کے دیہاتوں اور قصبوں کے تمام لوگ پیدل اور گھوڑوں پر سوار ہو کر بھلہ شریف کا رخ کر رہے ہوں۔ جب ہم بھلہ پہنچے تو ایک وسیع میدان میں غازی صاحب کی میت لائی گئی۔ کلمہ گو عقیدت مندوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اس عاشق رسول کی میت کا دیدار کرنے کے لیے امڈ آیا تھا۔ نماز جنازہ کی ادائیگی اور میت کے دیدار کے بعد ہم چکوال شہر واپس چلے آئے۔ اگرچہ میں نے اپنی زندگی میں بہت سے جنازوں میں شرکت کی مگر غازی مرید حسین شہیدؒ کے جنازے میں لوگوں کی جو والہانہ عقیدت نظر آئی وہ صرف ایک مرتبہ ہی نصیب ہوئی۔“ [۲۵]

سماج کے ایک اور رویے کی نشاندہی بڑے واضح انداز میں کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اس وقت کے اساتذہ پڑھانے کو اپنی سرکاری ڈیوٹی ہی نہیں بلکہ ایک اہم اور اخلاقی فریضہ سمجھ کر ادا کرتے تھے۔ جب اساتذہ ایسے ہوں گے تو سماج میں پروان چڑھنے والے نوجوانوں کا اخلاق بھی بہت بلند ہونا ایک لازمی امر ہے۔ اساتذہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ ایک نسل تیار کر رہے ہیں جنھوں نے مستقبل میں ملک کی باگ ڈور سنبھالنا ہے۔ وہ ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دیتے تھے۔ ٹیوشن کا کوئی رواج نہیں تھا۔ سکول کے بعد بھی اساتذہ مفت تعلیم دیتے نظر آتے تھے۔ اساتذہ اپنے گھروں میں بچوں کو بلا کر انہیں پڑھاتے تھے۔ سماج میں ان کا احترام بھی بہت زیادہ تھا۔ اساتذہ کی عزت و احترام کرنے والے موجود تھے۔ تدریس کو اہم پیشہ تصور کرتے ہوئے۔ پوری دل جمعی سے پڑھاتے تھے۔ وہ صرف ڈیوٹی ہی انجام نہ دیتے بلکہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے علاوہ ان کی اخلاقی سطح پر تربیت کرتے تاکہ وہ سماج کے بہتر شہری بن کر زندگی گزاریں۔ سکول کے بچے گھر سے لائے ہوئے مکھن کے پراٹھے تفریح کے وقفہ میں بیٹھ کر کھاتے تھے۔ بچوں کے لباس بھی نہایت سادہ ہوتے۔ عبدالمجید ملک اس حوالے سے اپنی آپ بیتی میں رقم طراز ہیں:

> ”جب ہم سکول میں زیر تعلیم تھے تو گردونواح سے آنے والے تمام طلباء نہایت سادہ لباس میں ملبوس ہوتے۔ وہ اپنی ماؤں سے دن کے کھانے کے لیے پراٹھے پکوا کر لاتے جو تفریح کے وقفہ میں بیٹھ کر مزے سے کھاتے۔ اس وقت کے اساتذہ پڑھانے کو صرف اپنی سرکاری ڈیوٹی نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ تدریس کو اپنا اخلاقی اور دینی فریضہ سمجھ کر سرانجام دیتے تھے۔“ (۲۶)

قیام پاکستان سے پہلے ہندو، سکھ اور مسلمانوں میں بھائی چارہ بہت مثالی تھا۔ ایک دوسرے کا خیال رکھتے دکھ، سکھ میں شریک ہوتے۔ اکٹھے کھیلوں، میلوں اور تماشوں میں شریک ہوتے۔ خوشی اور غم میں ایک دوسرے کا بازو بنتے۔ سکولوں، کالجوں میں اکٹھا پڑھتے۔ ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا رہا۔ کبھی مذہب یا کبھی فرقوں کا جھگڑا دیکھنے میں نہ آتا تھا۔ ہر طرف محبت، انسیت اور بھائی چارے کی فضا تھی۔ ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں کا خیال رکھا جاتا۔ ہندو اور سکھ معاشی طور پر مسلمانوں سے بہت بہتر تھے

کیونکہ شروع سے ہی زیادہ تر دھیان کاروبار کی طرف رہا ہے۔ وہ یا تو دکانداری کرتے یا پھر تجارت کا پیشہ اپنا لیتے۔ مسلمان معاشی طور پر ان سے قدرے کمزور رہے ہیں وہ ان کے ہمیشہ مقروض ہو جاتے تھے۔ قیام پاکستان سے قبل کا جو منظر نامہ سماج میں موجود تھا وہ بہت یادگار اور محبت سے لبریز تھا۔ دلوں میں محبت کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ ایک دوسرے کے لیے جان تک کی بازی لگا دینے کو تیار ہوتے۔ کبڈی کے کھیل میں تینوں مذاہب کے لوگ شریک ہوتے۔ زور آزمائی کے مقابلے میں بھی شرکت کرتے۔ میلوں ٹھیلوں پر تینوں مذاہب کے نوجوان دوڑوں اور دیگر کھیلوں میں شریک ہو کر آپس میں محبت کا پرچار کرتے نظر آتے تھے۔ عبدالمجید ملک نے اپنی خودنوشت ''ہم بھی وہاں موجود تھے'' میں سماج کے اس رویے کی بھی عکاسی بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے۔

> ''ہمارا علاقہ اگرچہ مسلم اکثریتی علاقہ تھا مگر ہر گاؤں میں دو یا تین ہندوؤں اور سکھوں کے گھر ضرور تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے تجارت پر اجارہ داری حاصل کر رکھی تھی اور مسلمان اکثر اوقات ان کے مقروض اور مرہون منت ہی رہتے تھے۔ کسی بھی گاؤں میں ان غیر مسلموں کے گھر معاشی طور پر مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر ایک بات جس کا ذکر میں ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہندو، سکھ اور مسلمان ان تینوں کے مابین جو افہام و تفہیم تھی اس کی صورت حال موجودہ ان احوال سے بہت بہتر تھی جو اب مسلمانوں کی مختلف فرقوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔'' (۲۷)

عبدالمجید ملک کی آپ بیتی میں ناسٹلجیا کا استعمال بھی کثرت سے ملتا ہے۔ وہ ماضی کی یادوں میں کھوئے ہوئے رہتے ہیں انھیں حال کے بجائے ماضی کا سماج بہتر اور اچھا دکھائی دیتا ہے۔ لوگ سیدھے سادے اور ایک دوسرے سے محبت کرنے والے تھے۔ عالم دین بھی بہت قابل تھے جن میں پیار و محبت کے جذبات بکثرت پائے جاتے۔ ایک دوسرے سے بھائی بھائی کی فضا عام تھی۔ فرقہ واریت کی ہوا ابھی نہیں چلی تھی۔ سادگی اور دلوں میں محبت کے جذبات تھے۔ کوئی کسی کے لیے بغض، حسد اور نفرت کے جذبات نہ رکھتا تھا۔ برداشت کا عنصر حد سے زیادہ تھا ایک دوسرے کی باتیں سن کر اشتعال انگیزی پیدا نہ ہوتی تھی۔ چھوٹے بڑے کا لحاظ تھا آنکھوں میں شرم اور حیا کا عنصر بدرجہ اتم موجود تھا۔ وہ دور بہت پر سکون اور اطمینان

بخش تھا کہیں کوئی جھگڑا نہ ہوتا بس کبھی کبھار زمین کا تنازعہ ہوتا بھی تو اسے بزرگوں کی مشاورت سے حل کر لیا جاتا۔ اس پر سکون سماج کی عکاسی عبدالمجید ملک نے "ہم بھی وہاں موجود تھے" میں انتہائی عمدگی سے پیش کی ہے۔

"اس زمانے میں نہ اتنے عالم تھے اور نہ اتنی کتابیں، سیدھے سادے مسلمان تھے جن میں بغض اور نفاق کا شائبہ تک نہیں تھا۔ عبادت گاہوں میں بھی کسی ایسے پہلو کا ذکر نہیں کیا جاتا تھا جس سے فرقہ واریت کا اظہار ہو۔ لوگوں کے عقائد پر کوئی سوالیہ نشانات تک نہیں تھے۔ لوگوں کا ایمان اور عقیدہ سادہ مگر مضبوط تھا اور اس میں کوئی پیچیدگی یا ملاوٹ نہیں تھی۔ اس دور کے سادہ طرز زندگی میں برداشت کا عنصر بہت زیادہ تھا اگرچہ کبھی کبھی زمین کے جھگڑے بھی ہو جاتے تھے مگر بحیثیت مجموعی وہ دور نہایت پر سکون دور تھا۔ وسائل نہ ہونے کے باوجود لوگ مطمئن تھے۔" (۲۸)

ذرائع آمد و رفت آج بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ جدید کاریں، موٹر سائیکلیں، جیپ اور دیگر ذرائع موصلات آگئے ہیں ایک دور میں یہ تمام اشیاء عنقا تھیں اور لوگ بیس بیس / تیس تیس میل پیدل سفر کرتے تھے۔ دیہاتوں میں زمیندار، ترکھان، نائی اور دیگر پیشے عام تھے ذات پات کا عنصر موجود تھا لیکن ان میں مثالی بھائی چارے کی فضا موجود تھی۔ ایک دوسرے کا خیال رکھا جاتا تھا۔ علاج معالجے کی سہولیات نہ ہونے کے برابر تھیں لوگ پیدل سفر کر کے شہروں کا رخ کرتے۔ بیماریاں بھی بہت کم ہوتیں۔ آج زمانہ جتنی تیزی سے ترقی کر رہا ہے اتنی ہی تیزی سے مہلک مرض بھی بڑھ گئے ہیں ایسی ایسی جان لیوا بیماریاں آگئی ہیں۔ سائنس جتنی ترقی کرتی جاتی ہے بیماریاں بھی اسی حساب بڑھتی ہی چلی جارہی ہیں۔ دیہاتوں میں خالص غذائیں، خالص آب و ہوا اور صاف ستھرا ماحول مہیا ہوتا ہے اس لیے بھی دیہاتی بہت کم بیمار ہوتے ہیں۔ عدالت میں اپنے مقدمات کے لیے بھی انہیں تیس کلو میٹر تک کے فاصلے پیدل طے کرنا پڑتے۔ عبدالمجید ملک جس سماج کی عکاسی کر رہے ہیں وہ سماج نہایت سادہ اور محبت و بھائی چارے کی فضا لیے ہوئے تھا۔ وہ اپنی آپ بیتی میں اس کی عکاسی کچھ یوں کرتے ہیں:

"اگرچہ دیہات میں ذات پات کا عنصر موجود تھااور لوگ زمیندار،۔۔۔۔۔ ترکھان ،نائی اور دیگر پیشوں میں تقسیم تھے مگر باہمی بھائی چارے کی ایک فضا معاشرے میں مجموعی طور پر صاف نظر آتی تھی۔ اس وقت نہ اتنے ڈاکٹر تھے اور نہ اتنی بیماریاں، لوگ دور دراز تک پیدل سفر کرتے تھے، چار پہیوں والی سواری بالکل مفقود تھی ہمارے گاؤں میں لوگ چکوال تک تیس کلو میٹر پیدل اپنے مقدموں کی تاریخ بھگتنے آتے تھے پیدل ہی واپس جاتے تھے۔"(۲۹)

دیہاتوں میں میلوں ٹھیلوں، بیساکھی کے میلے یا پھر مذہبی تہواروں پر جو کھیل کھیلے جاتے تھے۔ کئی مرتبہ یہ مقابلے کسی بزرگ کے عرس پر انعقاد پذیر ہوتے۔ ان میں کبڈی بہت معروف اور مقبول کھیل سمجھا جاتا تھا جس میں ہندو، سکھ اور مسلمان نوجوان حصہ لیتے۔ کبڈی کے مقابلے دیہاتوں میں بہت عام تھے۔ کھلے میدانوں میں اس کھیل کو کھیلا جاتا رہا ہے۔ دیہاتوں کے بزرگ، نوجوان اور بچے اس کھیل کو دیکھنے کے لیے جوق در جوق میدانوں کا رخ کرتے تھے۔ کسی دور میں جوڑا کبڈی کا رواج تھا۔ مگر بعد میں چھوٹی کبڈی کا رواج ہوا تو اس چھوٹی کبڈی نے زیادہ شہرت حاصل کر لی آج کل یہ چھوٹی کبڈی کے مقابلہ جات ہی منعقد ہوتے ہیں۔ شہروں کی نسبت دیہاتوں میں اس کا رواج بہت عام ہے۔ وزنی پتھر اٹھانے کے مقابلے میں نوجوانوں میں ہوتے تھے۔ سماج میں یہ کھیل بہت عام تھے۔ عبدالمجید ملک نے بھی اپنی آپ بیتی میں اس کا تذکرہ کچھ یوں کیا ہے:

"کبڈی کا علاقے میں رواج عام تھا عموماً دو قسم کی کبڈی کھیلی جاتی تھی یعنی لمبی کبڈی (جوڑے والی) اور چھوٹی کبڈی، جوڑے والی کبڈی میں ایک کھلاڑی بھاگتا اور دو اس کو پکڑتے۔ اس وقت یہی ہمارے علاقے کی معروف کبڈی تھی۔ چھوٹی کبڈی کا رواج بعد میں ہوا۔ وزنی پتھر اٹھانے کو مردانگی اور ہمت کی علامت خیال کیا جاتا۔" (۳۰)

دیہاتی سماج میں لوگوں کے پاس ایک دوسرے کے لیے خاص وقت ہوتا ہے۔ دیہاتی سماج میں لوگوں کا زیادہ تر پیشہ کاشت کاری ہوتا ہے، دن بھر یہ لوگ کھیتوں اور مویشیوں کے کام میں مصروف رہتے ہیں اور رات کو کسی چوپال پہ اکٹھے ہو کر بیٹھتے ہیں۔ اس دوران جو امور ان کے ہاں زیادہ تر زیر بحث آتے ہیں وہ فصلوں اور مویشیوں کے حوالے سے ہی ہوتے ہیں ان لوگوں کا یہ بیٹھنا دن بھر کی تھکن دور کرنے بھی باعث بنتا ہے۔ عبدالمجید ملک نے دیہاتی سماج کے اس پہلو کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

”شام اور رات کو حقے کی محفلیں جمتی تھی اور لوگ بیٹھ کر گپ شپ لگاتے تھے جس کا عمومی موضوع فصل ، بارش اور زراعت ہوتی یا پھر جانوروں اور مویشیوں کے تذکرے ہوتے اور کبڈی کے نامور کھلاڑیوں کے افسانے جاری رہتے۔ چاندنی راتوں میں نوجوان عموماً گاؤں سے باہر نکل کر مختلف کھیل کھیلتے جن میں ” لال توایا“ کا کھیل بہت مشہور تھا کچھ لوگ کسی حویلی یا گاؤں کے اطراف میں اکٹھے ہو کر علاقائی گیتوں سے دل بہلاتے۔“ (۳۱)

دیہاتی سماج میں نوجوانوں کے ہاں بے فکری زیادہ نظر آتی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے مل کر زندگی کو بڑی خوبصورتی سے گزارنے کے جتن کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونا اپنے لیے عزت کا باعث سمجھتے ہیں۔ دیہات میں سماجی سطح پر دلچسپی ( Intertainment) کے مواقع بھی یہ لوگ خود ہی پیدا کرتے ہیں۔

موسیقی کو گاؤں کے سماج میں خاص عمل دخل ہے۔ یہ موسیقی حقیقی ہوتی ہے ہر گاؤں میں چند ایسے خوش الحان لوگ ہوتے ہیں جو پورے سماج کے لیے مسرت فراہم کرتے ہیں گاؤں کے سماج میں ایسے لوگوں کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ عبد المجید ملک گاؤں کے سماج کے اس خوب صورت پہلو کو یوں بیان کرتے ہیں:

”موسیقی اور گیت سننے کے لیے لوگ گاؤں اور علاقے کے خوش الحان افراد کے پاس جمع ہوتے اور ان کے گیتوں سے لطف اندوز ہوتے۔ راہ چلتے ہوئے مسافر اور ہل چلاتے ہوئے کسان اکثر اوقات گیت گاتے اور گنگناتے سنائی دیتے۔ ان کے مخصوص پنجابی گیت کو ”سد مارنا“ کہا جاتا تھا۔“ (۳۲)

برصغیر کے سماج میں کئی روشن پہلو ہیں جن میں سے ایک اہم بزرگان دین سے عوام کی گہری عقیدت ہے۔ عوام ان بزرگوں کے لیے دل میں خاص عقیدت رکھتے ہیں اور ان کے درباروں پر حاضری دینے کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے ہیں۔

بزرگان دین کے درباروں پر منعقد ہونے والے ان کے عرس جہاں ایک طرف لوگوں کی ان بزرگان دین سے عقیدت کو ظاہر کرتے ہیں وہیں دوسری طرف ثقافتی اظہار بن کر بھی ابھرے ہیں۔ ان بزرگان کے درباروں پر لگنے والے میلوں ٹھیلوں میں مقامی ثقافت اور سماجی روایات پورے عروج پر نظر آتی ہیں۔ عبدالمجید ملک نے اپنی آپ بیتی میں جہاں برصغیر کے سماج کے دیگر بہت سے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے وہاں اس بارے میں بھی وہ رقم طراز ہیں:

"درباروں اور خانقاہوں پر منعقد ہونے والے عرس اور میلے عوام کی دلچسپی کا باعث ہوتے تھے ہمارے قریبی گاؤں پادشاہان میں منعقد ہونے والا میلہ جو آج بھی کسی نہ کسی طور پر جاری ہے مگر اس زمانے میں اس کا اپنا ہی جادو تھا۔ بہت سے لوگ مختلف پیروں کے مرید ہوتے تھے... اس وقت پیران عظام سے لوگوں کی جو والہانہ عقیدت تھی وہ ناقابل بیان ہے۔ پیر پرستی ضرور تھی مگر سجدہ گری نہیں تھی۔" (۳۳)

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مفاد پرست عناصر نے ان بزرگان دین کے درباروں سے بھی اپنے مفادات وابستہ کر لیے جن کے حصول میں طرح طرح کی خرافات ان درباروں پر رواج پانے لگے ہیں۔ پوجا پاٹ اور سجدہ ریزی نے ان درباروں کے اصل حسن کو گہنا دیا۔ عبدالمجید ملک نے اپنی آپ بیتی میں سماج کے ان اہم مقامات پر رواج پانے والی خرافات کو بھی واضح کیا ہے۔

قیام پاکستان سے قبل جب سماج میں میڈیا کی کارستانیاں اتنی زیادہ نہیں ہوئی تھیں اور لوگ ٹی وی اور دیگر ایسی خرافات سے دور تھے تو سادہ زندگی تھی جو ایک دوسرے کے احترام اور رویوں میں خلوص پر مبنی تھی۔ لوگ بغیر کسی لالچ کے دوسروں کا احترام کرتے تھے۔ عبدالمجید ملک کے الفاظ میں:

"اس دور میں ہمارے معاشرے اور ماحول پر ایک خاص قسم کی معصومیت اور سادگی کی فضا غالب تھی۔ دیہات میں خواتین ظاہری اور روایتی پردہ نہیں کرتی تھیں مگر ان کی آنکھوں میں موجودہ زمانے والی بے باکی کے بجائے حیا کا عنصر موجود تھا اور مرد بھی خواتین کا صحیح معنوں میں احترام کرتے کیا مجال جو کوئی مرد کسی کی بہن بیٹی کو

> آنکھ اٹھا کر غلط نگاہ سے دیکھے اکثر گھروں کی چار دیواری نہیں ہوتی تھی اور لوگ ایک دوسرے کے صحن سے گزرتے رہتے تھے لیکن کسی کو کوئی شکایت ہوتی تھی اور نہ ہی کوئی غیر اخلاقی اور غیرت کا مسئلہ پیدا ہوتا تھا۔" (۳۴)

یہ روشن سماجی اقدار تھیں جو اس وقت کے سماج میں پائی جاتی تھیں۔ لوگوں کے دلوں میں احترام اور نظر میں حیا اور غیرت تھی۔ دوسروں کی خواتین کو وہ اپنی بہن بیٹیوں جیسی عزت دیتے تھے۔ رشتوں میں خلوص پایا جاتا تھا لوگ ایک دوسرے کی عزتوں کے محافظ بن کر سماج کو اخلاقی حوالے سے زریں روایات کا آئینہ بنانے میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ عزتوں کی حفاظت، حیاداری اور خلوص و احترام اس سماج کا اہم وصف بن چکا تھا۔ ان روشن اخلاقی اور سماجی اقدار کی پابندی سماج میں بسنے والے سب لوگوں پر لازم تھی یہی وجہ ہے کہ کم وسائل اور کم سہولیات کے باوجود وہ سماج آج سے زیادہ پر سکون تھا۔

عبدالمجید ملک نے سماجی اقدار کی عکاسی کے ساتھ ساتھ سماج میں رشتوں کے تصور کو بھی اپنی آپ بیتی میں بیان کیا ہے۔ برادریوں میں رشتے کس طرح طے کیے جاتے تھے اس بارے میں وہ لکھتے ہیں :

> "اس دور میں وٹہ سٹہ یا "دواٹھی" کے رشتوں کا رواج بہت عام تھا جس کے تحت مختلف خاندانوں کو ایک مضبوط بندھن میں باندھ دیا جاتا۔۔۔۔ اس رواج میں کچھ قباحتیں ضرور تھیں مگر فائدے بھی بہر حال موجود تھے۔" (۳۵)

عبدالمجید ملک نے صرف سماج میں ہی نہیں بلکہ فوج میں بھی سماجی اقدار کو اپنی آپ بیتی میں بیان کیا ہے۔ وہ ساری زندگی فوج میں رہے۔ پہلے کلرک سپاہی اور پھر اعلیٰ آفیسر تک انھوں نے مختلف عہدوں پر کام کیا۔ وہ فوج میں موجود مختلف اقوام اور مختلف قبیلوں کے لوگوں کے مابین رواج پانے والی سماجی اقدار سے بھی خاص واقفیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آپ بیتی میں جہاں سماج کے دیگر پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے وہاں انھوں نے فوج میں بھی مختلف علاقوں اور مختلف قوموں سے تعلق رکھنے والے فوجیوں کے درمیان سماجی اقدار کو بھی واضح انداز میں بیان کیا ہے عبدالمجید ملک فوج میں سماجی اقدار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ”فوج میں مختلف گروہوں پر مشتمل ” ہانڈی وال“ کا ایک نظام قائم تھا جس کے تحت برادری اور رشتہ داری کی طرح چند لوگ گہرے رشتوں میں منسلک ہو جاتے ہیں ہماری بھی ایک ایسی ہی ” ہانڈی وال“ تھی جس کے دو ممبران تھے ہم لوگ اکثر اوقات چھٹی گزار کر اپنے گھر سے دیسی گھی وغیرہ لے کر آتے اور لنگر کی دال کو اپنی ہانڈی والی میں تڑکا لگا مزے سے کھاتے۔ ہانڈی وال کا رشتہ شاید عام آدمی کے لیے سمجھنا آسان نہیں لیکن یہ بھائی چارے کا ایسا مضبوط ترین رشتہ ہے جو تاحیات قائم رہتا ہے۔“ (۳۶)

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالمجید ملک کی سماج پر گہری نظر تھی۔ انھوں نے صرف فوج کی پیشہ ورانہ سرگرمیوں کی عکاسی نہیں بلکہ سماجی اقدار کو بھی خاص طور پر بیان کیا ہے وہ ایک سماجی شخصیت تھے۔ فوج کی ملازمت کے دوران میں انھوں نے بہت سے محاذوں پر دادِ شجاعت دی۔ مختلف مشقوں اور لڑائیوں میں سماج کی مختلف صورتوں کا ذاتی مشاہدہ کیا اور بعد میں ان تجربات اور مشاہدات کو آپ بیتی کی صورت میں قارئین کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے ایک سلجھے ہوئے پختہ فکر لکھاری کی طرح سماج کے مختلف زاویوں کو واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ سماج میں بسنے والے مختلف لوگوں کے آپس میں رشتے اور دوسرے لوگوں اور اقوام کے ساتھ تعلقات کو انھوں نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

ہجرت کے واقعات میں سماجی اقدار کی جو پامالی ہوئی تاریخ میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ ان واقعات میں بہت سے لوگوں کو مصائب کا سامنا کرنا پڑا جب کہ بعض لوگ بآسانی منزل پر پہنچنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ عبدالمجید ملک ہجرت کے واقعات کے ذاتی تجربے کو یوں بیان کرتے ہیں:

> ”بھارت سے پاکستان جاتے ہوئے راستے میں ہجرت کرنے والے کئی افراد اور قافلے بھی ہماری ٹرین میں سوار ہوتے گئے۔ پنجاب میں سکھوں کے نیزہ بردار جتھے مسلمانوں کا قتل عام کرنے میں دیوانہ وار مصروف تھے۔ پنجاب میں قتل و غارت اور فسادات عروج پر تھے۔ ہماری ٹرین نے بھی چونکہ اسی علاقے سے گزرنا تھا اس لیے ہم نے ممکنہ خطرات کے پیش نظر ٹرین میں مشین گنیں نصب کر رکھی تھیں اور مسلح فوجی بھی تعینات تھے۔ پٹیالہ کے پاس سکھوں کے ایک گروہ کی طرف

سے ٹرین پر حملہ کی کوشش بھی کی گئی مگر ہمارے مستعد فوجیوں کی موجودگی میں حملہ آوروں کو بالکل جرأت نہ ہوئی کہ وہ ٹرین میں داخل ہوں یا کسی قسم کا نقصان پہنچائیں۔" (۳۷)

سکھوں کے مسلح جتھوں نے جہاں موقع ملا لوٹ مار کا بازار گرم کیے رکھا۔ لوگوں کی عزتوں کو پامال کرنے میں انھیں خاص تسکین ملتی تھی۔ کئی بے گناہ عورتیں اور جوان لڑکیاں ان کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ لوگ لٹے پٹے مہاجرین کی حالت میں پاکستان پہنچ رہے تھے اور ادھر کیمپوں میں بھی استحصال کا بازار گرم تھا۔ اردو ادب میں بہت سے ناولوں اور افسانوں میں ہجرت کے ان المناک واقعات کی عکاسی کی گئی ہے۔ عبدالمجید ملک کو بھی ان واقعات کا ذاتی تجربہ ہوا تھا لیکن یہ چونکہ فوج کے آفیسر تھے اور فوجیوں کے پاکستان منتقل ہونے والی ٹرین میں باحفاظت نہ صرف خود پہنچے بلکہ دیگر بہت سے لوگوں کو پہنچانے میں بھی مدد دی۔ اس سفر کے دوران مختلف واقعات انھوں نے اس طرح بیان کیے ہیں کہ اس دور میں ہونے والی سماجی اقدار کی پامالی کا پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

تقسیم ہند کے وقت ہونے والی ہجرت میں وہاں سے بہت سے لوگ پاکستان آئے تو پاکستان میں مقیم بہت سے ہندو اور سکھ بھی یہاں سے ہندوستان چلے گئے دونوں طرف سے قافلوں کی صورت میں لوگ منتقل ہو رہے تھے لیکن پاکستان سے سکھوں اور ہندوؤں کی منتقلی بڑے محتاط انداز میں اور باحفاظت کی جاری تھی۔ یہ اس سماج کا مثبت پہلو تھا جسے عبدالمجید ملک نے اپنی آپ بیتی میں یوں بیان کیا ہے۔

"ہمارے گاؤں اور علاقے سے ہندوؤں اور سکھوں کی بھارت روانگی بھی ایک قابل ذکر پہلو ہے۔ میں اگرچہ اس کا چشم دید گواہ نہیں مگر مجھے بتایا گیا جب پاکستان کے قیام کا اعلان ہوا تو ہمارے علاقے کے تمام ہندو اور سکھ تقسیم کے بعد فوری طور پر دو مراکز میں اکٹھے ہوئے یعنی دولتانہ اور چکوال شہر میں انھوں نے آکر ٹھکانہ کیا۔ ان دو مقامات پر محدود پیمانے کے ریگزٹ کیمپ بنائے گئے جہاں سے ہندوؤں اور سکھوں کو قافلوں کی صورت میں بھارت بھیجا گیا۔" (۳۸)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو عبدالمجید ملک کی آپ بیتی " ہم بھی وہاں موجود تھے " حقیقی معنوں میں سماجی منظر نامے کی عکاسی کرتی ہے۔ انھوں نے جہاں قیام پاکستان سے قبل کے ہندو مسلم معاشرے کے مختلف سماجی رویوں اور سماجی اقدار کو بیان کیا ہے وہاں قیام پاکستان کے وقت ہجرت کے موقع پر سماجی اقدار کی پامالی اور سماجی صورت حال کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ قیام پاکستان کے بعد پاکستانی سماج کی بھی بھرپور عکاسی اس آپ بیتی میں کی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی یہ آپ بیتی جگ بیتی کا درجہ رکھتی ہے۔

## د: "فرزندِ پاکستان" اور " ہم بھی وہاں موجود تھے" کے سماجی شعور کا تقابل:

اُردو ادب میں آپ بیتی کی روایت کا جائزہ لیں تو شیخ رشید احمد کی آپ بیتی " فرزند پاکستان " اور عبدالمجید ملک کی آپ بیتی " ہم بھی وہاں موجود تھے " خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ ان دونوں آپ بیتوں میں بہت سے امور میں مماثلت بھی نظر آتی ہے اور بہت سے امور میں اختلافات بھی سامنے آتے ہیں۔ یہاں ہمارا موضوع ان دونون کا سماجی حوالے سے تقابلی جائزہ ہے۔ اس لیے ہم اپنی بحث کو سماجی تناظر تک ہی محدود رکھیں گے۔

شیخ رشید احمد اور عبدالمجید ملک دونوں شخصیات نے پاکستان کے خطہ پوٹھوہار میں جنم لیا۔

شیخ رشید احمد کا تعلق پوٹھوہار کے اہم ترین شہر راولپنڈی سے ہے جبکہ عبدالمجید ملک کا تعلق خطہ پوٹھوہار کے ایک گاؤں جند ساؤ اعوان ضلع چکوال سے ہے۔ ایک ہی خطے میں رہنے کی وجہ سے جہاں دونوں کے ہاں مماثلت پائی جاتی ہے وہاں اختلاف یہ بھی ہے کہ شیخ رشید احمد خطہ پوٹھوہار کے مرکزی شہر میں رہے جس کی وجہ سے پوٹھوہار کے شہری سماج کو بچپن سے بہتر طریقے سے سمجھتے ہیں جبکہ دوسری جانب عبدالمجید ملک کا شمار ضلع چکوال کے دور افتادہ گاؤں جند ساؤ اعوان سے ہے وہ دیہی سماج کی محنت ومشقت سے آگاہ تھے۔ اگرچہ فوج میں ملازمت کے دوران انھوں نے بھی شہری زندگی کو قریب سے دیکھا اور پاکستان کے متعدد علاقوں کے دیہی اور شہری سماج سے وابستہ رہے لیکن ان کا بچپن خالصتاً پوٹھوہار کے دیہات سے تھا۔ جبکہ شیخ رشید احمد ہمیشہ سے راولپنڈی کے سماج سے وابستہ رہے۔

اگرچہ عبدالحمید ملک کا فوج اور اس کے بعد سفارت اور سیاست کی وجہ سے مختلف سماج کے لوگوں سے تعلق رہا ہے تو دوسری جانب شیخ رشید احمد کا تعلق دوسرے سماج کے لوگوں سے بحیثیت تاجر اور سیاست دان رہا۔ اگرچہ دونوں کے خاندانی سماج پر نظر دوڑائی جائے تو دونوں کے خاندان متوسط اور محنت کش ہیں۔ دونوں خاندانوں کے گزر بسر میں سادگی ان کی تصانیف سے واضح ملتی ہے۔

فرق صرف یہ ہے کہ ایک کا خاندان سپاہ گری اور دیہات میں رہنے کی وجہ سے کھیتی باڑی سے وابستہ رہا جبکہ دوسری جانب شیخ رشید احمد کا خاندان تجارت سے وابستہ رہا۔ لیکن دونوں کی زندگی میں جہاں زمانی اعتبار سے خاصا فرق پایا جاتا ہے وہیں پیشہ ورانہ زندگی میں بھی خاصا فرق ہے۔ شیخ رشید احمد شروع ہی سے سیاسی ذوق کے حامل تھے بعد میں قالینوں کے کاروبار سے وابستہ ہوئے یوں ان کا حلقہ احباب کاروباری حوالے سے خاصا وسیع تھا جب عبدالمجید ملک آرمی کے آفیسر تھے اور آرمی کے حوالے سے سے خاصی معلومات رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں آپ بیتیوں میں ملک میں لگائے گئے مارشل لاء کے بیان میں یکسانیت ہونے کے باوجود عبدالمجید ملک کی آپ بیتی ''ہم بھی وہاں موجود تھے'' میں مارشل لاء کے حوالے سے زیادہ وسیع معلومات ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ سماجی سطح پر مارشل لاء کے جو اثرات مرتب ہوئے ان کو دیکھنے کا انداز بھی دونوں کا الگ الگ ہے۔ شیخ رشید احمد کی آپ بیتی ''فرزند پاکستان'' میں مارشل لاء ذمہ دار فوجی حکمرانوں کی اقتدار کی ہوس کو ٹھہرایا گیا ہے۔ جب کہ عبدالمجید ملک کے ہاں ہمیں محتاط انداز میں نقطہ نظر بیان کرنے کا رجحان ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ چونکہ آرمی آفیسر رہے تھے اس لیے آرمی کے ڈسپلن کی پابندی وہ لاشعوری طور پر بھی کرنے پر مجبور تھے۔ ان کی پیشہ ورانہ زندگی کے اثرات ان کی آپ بیتی پر بھی نظر آتے ہیں۔

سماجی حوالے سے ان دونوں آپ بیتیوں میں سماج کے بیان میں خاصا فرق پایا جاتا ہے۔ اس فرق کی سب سے بڑی وجہ وہ زمانی بُعد ہے جو ان دونوں آپ بیتیوں کے زمانوں میں پایا جاتا ہے۔

عبد المجید ملک کی پیدائش ۱۹۱۹ء میں ہوئی اور ان کی آپ بیتی کا آغاز بھی ۱۹۱۹ء کے دور سے ہوتا ہے۔ انھوں نے اس دور کے سماج کا پورا نقشہ اپنی آپ بیتی میں بیان کیا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل کی سماجی صورت حال، مسلمان، ہندو، سکھ اور دیگر اقوام کے آپس میں تعلقات اور سماجی رشتے داریوں کا بیان ملتا ہے۔ اس کے علاوہ عبد المجید ملک کے ہاں قیام پاکستان سے قبل کے سماج میں پروان چڑھنے والے مختلف رجحانات اور آزادی کی تحریکوں میں لوگوں کے جوش وجذبے کے حوالے سے سماجی تناظر میں خاصی بحث کی گئی ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے سماجی منظر نامے کو بیان کرتے وقت اس سماج میں پائی جانے والی مختلف اقوام اور ان کے مخصوص روّیوں کی بھی عکاسی کی ہے جن سے قیام پاکستان سے قبل کے سماجی منظر نامے سے خاص آگاہی ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں جب ہم شیخ رشید احمد کی آپ بیتی " فرزند پاکستان " کا سیاسی حوالے سے جائزہ لیتے ہیں تو اس میں قیام پاکستان سے قبل کے سماجی منظر نامے کا کوئی بیان نہیں ملتا۔ ان کی آپ بیتی تحریک پاکستان کے سماج پر اثرات اور اس تحریک کی کامیابی کے لیے سماج کے تمام طبقات کے میدان میں لکھنے کے ذکر سے یکسر خالی ہے۔

تقسیم ہند کے وقت ہجرت کی صورت اور سماج پر اس کے اثرات کے حوالے سے دیکھا جائے تو عبد المجید ملک کی آپ بیتی میں قیام پاکستان کے بعد ہونے والی ہجرت اور سماج پر اس کے اثرات کا گہرا جائزہ لیا گیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف خود ہجرت کی بلکہ ہجرت کے اس عمل کو آنکھوں سے دیکھا یوں انھوں نے اس دوران میں ہونے والے واقعات کو ایک چشم دید گواہ کی طرح بیان کیا ہے۔ قاری ان کی آپ بیتی پڑھتے ہوئے خود کو اس ماحول میں کھڑا محسوس کرنے لگتا ہے جہاں ہر طرف سماجی اقدار کی پامالی کی داستانیں بکھری پڑی تھیں۔ بے گناہ لوگ قتل وغارت کی بھینٹ چڑھ گئے تھے اور عزتوں کی پامالی اور انسانیت کی بے حرمتی عام ہوئی تھی۔ ان کی آپ بیتی میں ہجرت کے اندوہناک واقعات اور سماج پر ان کے اثرات کا بیان بڑی مہارت سے کیا گیا ہے جب کہ شیخ رشید احمد کی آپ بیتی "فرزند پاکستان" ایسے بیان سے یکسر خالی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ شیخ رشید احمد، عبد المجید ملک سے کم و بیش ۳۰ سال بعد پیدا ہوئے اور ان کی آپ بیتی کا زمانہ بھی ۱۹۵۰ء کے بعد شروع ہوتا ہے اس لیے ان کے ہاں ہجرت اور اس کے سماجی اثرات کا بیان نہیں ملتا۔

قیام پاکستان کے بعد کی سماجی صورت حال کے تناظر میں ان دونوں آپ بیتیوں کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ دونوں آپ بیتیوں میں سیاسی اور سماجی حالات تو ایک جیسے ہیں لیکن بیان کرنے کے انداز میں خاصا فرق نظر آتا ہے۔

"فرزند پاکستان" میں شیخ رشید احمد کے اس دور کے حالات بیان کرنے کا انداز ایک پُر جوش مقرر کا سا ہے وہ دور ان کی جوانی اور بھرپور سیاسی سرگرمیوں کا دور تھا۔ وہ سکول، کالج کی سیاست سے آگے بڑھتے ہوئے میونسپل اور پھر صوبائی اور قومی اسمبلی کی سیاست میں قدم رکھ چکے تھے۔ جوانی کے اس عہد میں وہ سماج کو ایک بے باک نوجوان کی طرح دیکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے اس زمانے کے حالات کے بیان میں خطابت کا سا انداز ملتا ہے۔ ان کے ہاں سماجی باشندوں کو ظلم اور استحصال کے خلاف نہ صرف کھڑے کرنے کا انداز ملتا ہے بلکہ اپنے حقوق کے حصول اور استحصال سے نجات حاصل کرنے کے لیے لڑنے مرنے کی ترغیب بھی ملتی ہے۔ اس کے برعکس عبدالمجید ملک کی آپ بیتی "ہم بھی وہاں موجود تھے" میں ان ہنگامہ خیز سیاسی و سماجی حالات کے بیان میں بھی پختہ فکر اور ٹھہراؤ کے ساتھ ساتھ معاملہ فہمی کا سا انداز ملتا ہے۔ عبدالمجید ملک کسی بھی سرگرمی کو تمام زاویوں سے دیکھتے ہیں اس کے حالات وواقعات کو جانچتے اور پرکھتے ہیں اور پھر اس پر رائے دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں کسی واقعے پر سماجی اثرات کا تجزیہ خاصا گہرا ملتا ہے اور واقعے کے بعد سماج پر اس کے اثرات کے بارے میں بھی غور و فکر پر مبنی تجزیہ ملتا ہے۔ وہ سیاسی واقعات کو بھی محض سیاست کے تناظر میں ہی نہیں دیکھتے بلکہ سماج بھی ان کے پیش نظر رہتا ہے۔

شیخ رشید احمد کا تعلق چونکہ کاروباری طبقے سے تھا اس لیے ان کی آپ بیتی میں سماج کے اس طبقے کے بارے میں مختلف زاویوں سے اظہار خیال ملتا ہے۔ وہ کاروباری افراد کی چالوں اور سماج کا باشندوں کی ان چالوں میں پھنسنے کو بیان کرنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس عبدالمجید ملک کا تعلق چونکہ نہ صرف ایک فوجی پس منظر والے گھرانے سے تھا بلکہ وہ خود بھی فوج کے اعلیٰ افسر رہے تھے فوج کی زندگی کا ڈسپلن ان کے سماجی مطالعے میں بھی نظر آتا ہے۔ وہ معاملات کو دیکھتے ہوئے خاصے دور اندیش واقع ہوئے ہیں۔

سماجی تناظر میں تقابلی انداز میں دونوں آپ بیتیوں کا جائزہ لیا جائے تو شیخ رشید احمد کی" فرزند پاکستان" کی نسبت عبد المجید ملک کی" ہم بھی وہاں موجود تھے" میں سماج کی عکاسی زیادہ بہتر انداز میں ہوئی ہے۔ شیخ رشید احمد نے سماج کی عکاسی بھی سیاسی ضرورت کے تحت کی ہے۔ انھوں نے جہاں بھی کسی سماجی مسئلے یا سماجی واقعے کو بیان کیا ہے کسی نہ کسی طرح سے ان کا تعلق سیاست سے بھی جوڑا ہے جب کہ عبد المجید ملک کے ہاں اس بارے میں سماج کی عکاسی سیاست سے ہٹ کر بھی ملتی ہے۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی میں مختلف سماجی رشتوں، مختلف اقوام اور مختلف برادریوں کے آپس میں تعلقات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ سماج کی مختلف رسم ورواج کی بھی عکاسی کی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی آپ بیتی سماجی منظر نامے کو ایک وسیع تناظر میں پیش کرتی ہے جب کہ شیخ رشید احمد کی آپ بیتی "فرزند پاکستان" ان کی سیاست کے احوال کے گرد ہی گھومتی نظر آتی ہے۔

شیخ رشید احمد اور عبد المجید ملک کا سیاسی سفر تقریباً ایک ہی دور کا ہے لیکن عبد المجید ملک اپنی عمر کا کافی حصہ گزارنے کے بعد سیاست کے کارزار میں داخل ہوئے جب کہ شیخ رشید احمد نے جوانی میں ہی سیاست کی خاطر سماج سے بھی گہرے تعلقات استوار کر لیے تھے۔ اس لیے ان کے ہاں سماج کا جو مشاہدہ بیان ہوا ہے وہ عام شخص کے حالات تک پھیلتا چلا گیا ہے جب کہ عبد المجید ملک کے ہاں عام شخص کے حالات کا بیان اتنی شدت سے نہیں ملتا۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سماجی شعور کے حوالے سے دونوں آپ بیتیاں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ دونوں آپ بیتیوں میں پاکستان کے سماج کا مشاہدہ بڑے دلکش اور رواں اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ مصنفین کے ذاتی مزاج اور زمانے کے حوالے سے فرق دونوں آپ بیتیوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

## حوالہ جات


۱۔ webistor English Dictionary London 1934, P. 35

۲۔ رشید احمد، شیخ، فرزند پاکستان، رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۳ء، ص۱۶

۳۔ ایضاً، ص۱۸

۴۔ ایضاً، ص۲۱

۵۔ ایضاً، ص۲۳

۶۔ ایضاً، ص۲۴

۷۔ ایضاً، ص۲۷۔۲۶

۸۔ ایضاً، ص۲۷

۹۔ ایضاً، ص۲۸

۱۰۔ ایضاً، ص۵۲

۱۱۔ ایضاً، ص۵۸

۱۲۔ ایضاً، ص۷۰

۱۳۔ ایضاً، ص۷۴

۱۴۔ ایضاً، ص۷۸

۱۵۔ ایضاً، ص۸۵

۱۶۔ ایضاً، ص۸۷

۱۷۔ ایضاً، ص۹۸

۱۸۔ ایضاً، ص۹۹

۱۹۔ عبدالمجید ملک، ہم بھی وہاں موجود تھے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص۱۸

۲۰۔ ایضاً، ص۱۸

۲۱۔ ایضاً، ص۱۹

۲۲۔ ایضاً، ص۲۰

۲۳۔ ایضاً، ص۲۲

۲۴۔ ایضاً، ص۲۳

۲۵۔ ایضاً، ص۲۵

۲۶۔ ایضاً، ص۲۶

۲۷۔ ایضاً، ص۲۷

۲۸۔ ایضاً، ص۲۷

۲۹۔ ایضاً، ص۲۸

۳۱۔ ایضاً، ص۲۸

۳۲۔ ایضاً، ص۲۹

۳۳۔ ایضاً، ص۲۹

۳۴۔ ایضاً، ص۳۰

۳۵۔ ایضاً، ص۳۰

۳۶۔ ایضاً، ص۳۶

۳۷۔ ایضاً، ص۴۸

۳۸۔ ایضاً، ص۵۰

## باب چہارم:

# ”فرزندِ پاکستان“ اور ”ہم بھی وہاں موجود تھے“ کے فن اور اسلوب کا جائزہ

## الف: اُسلوب کیا ہے؟

کسی بھی تخلیق کار کے پاس اپنے خیالات و احساسات اور تجربات کو دوسرے لوگوں تک پہنچانے کے لیے متعدد طریقے ہوتے ہیں۔ وہ ان طریقوں سے اپنی تخلیق کو تکمیل اور کامیابی کی طرف لے کر چلتا ہے۔ وہ جب اپنے خیالات، احساسات، تجربات اور جذبات کو احاطہ تحریر میں لانے کی سعی کرتا ہے تو اس کے سامنے موجود کئی اندازِ بیان میں سے وہ ایک یا بعض اوقات ایک سے زیادہ کو استعمال کرتا ہے۔ اظہار کے ان طریقہ ہائے کار کو اسلوب کہا جاسکتا ہے۔ یہ اسلوب کا عام معنوں میں مفہوم ہے۔ لیکن یہ اصطلاح اتنی سادہ نہیں ہے بلکہ جدید عہد میں اسلوب کے حوالے سے بے شمار بحثیں نظر آتی ہیں۔ لسانیات کے عروج کے ساتھ ساتھ جہاں دیگر شعبہ ہائے تخلیق میں تبدیلیاں واقع ہوئیں وہیں اسلوب اور اسلوبیات میں بھی نئی نئی بحثیں سامنے آئیں۔ اسلوب اور اسلوبیات چونکہ لسانیات سے گہرا رشتہ ہے اس لیے اس شعبہ میں ہر عہد کی لسانی صورت حال کے حوالے سے مختلف عناصر سامنے آتے گئے۔

اردو میں لفظ ”اسلوب“ انگریزی لفظ Style کے مترادف کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ لاطینی میں اسے Stylus اور یونانی میں Stylos کہا جاتا ہے۔ اسلوب کی تفہیم کے لیے جب ہم لغات کی طرف بڑھتے ہیں تو دی کونسائزڈ آکسفورڈ ڈکشنری میں اسلوب (Style) کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

“Style n.& v.t. In ancient writing implement small rod with pointed end for cratching letters on wax covered-tablet and blunt end for obliterating , thing of similar

shape esp for engraving , tracing etc, gnomon of sundial , (Bot) narrow extenion of ovary supporting stigma 2 manner of writing, speaking or doing esp, a cantrasted with the matter to be expreed or thing done.... 3. collective characteritics of the writing or diction or way of preenting thing or artitic expreion or decorative method. Proper to a person or school or period or subject manner exhibiting these characteritics. "(۱)

دی کونسائز ڈکشنری کی یہ تعریف اسلوب کے خدوخال بڑی صراحت سے واضح کرتی ہے۔ اس کے مطابق اسٹائل زمانہ قدیم میں لکھنے والے اس قلم کو کہا جاتا تھا جس سے موم کی ٹکیوں پر لکھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اس تعریف میں اصطلاحی معنوں کو بھی بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

اسلوب یا سٹائل کی تفہیم کے لیے نیو ویبسٹر ڈکشنری کی طرف رجوع کیا جائے تو اس کے مطابق

"Style: Syil n ( Fr. Style L.Stilus , style a stake , pointed intrument , style for writing hence mode of expresion , root a stimulus , stick, sting , spelling , influenced , by gr. styles , a pillar) Manner of writing or speaking with regard to language , that which has to do with form rather than content in a piece of literature , distinctive manner of writing belonging ti an author or body of authors , a characteristic mode of presentation in any way of fun arts. "(۲)

اس مفہوم کو دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ویبسٹر ڈ ڈکشنری نے بھی اسلوب یا سٹائل کے معنی لکھائی کے لیے استعمال ہونے والا نوک دار آلہ بتائے ہیں۔ اس کے علاوہ اصطلاحی معنوں پر غور کیا جائے تو اس ڈکشنری کے مطابق اسلوب کسی مصنف یا کسی ادبی گروہ یا ادبی دبستان سے تعلق رکھنے والے مصنفین کا وہ انداز نگارش ہے جس کے ذریعے وہ تخلیقی عمل انجام دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ اسلوب ان کے کسی بھی فن کا مخصوص انداز ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ دیگر بہت سی انگریزی لغات میں اس لفظ کے بارے میں معنی اور مفاہیم بیان کیے گئے ہیں۔ مجموعی طور پر انگریزی لغات میں اس لفظ کے جو مفاہیم بیان کیے گئے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے تو اس کے معنی قلم یا موم چڑھی ٹکیوں پر لکھنے والا آلہ، اندازِ بیاں، فنون لطیفہ سے متعلق کسی بھی فن کے اظہار کا خاص طریقہ، کسی شاعر، ادیب، مقرر یا کسی ادبی حلقے یا کسی دور کا وہ منفرد اظہار بیان ہے جو اس کی پہچان بن جاتا ہے۔

انگریزی لغات کے بعد جب ہم اسلوب کی تفہیم کے لیے اردو لغات کو دیکھتے ہیں تو یہاں بھی اس کے کئی معنی ملتے ہیں۔ اردو لغات میں اس لفظ کے مختلف مفاہیم یوں بیان کیے گئے ہیں۔

فرہنگ تلفظ میں اسلوب کے معنی ”طور، طریقہ، وضع، انداز، روش، حکمتِ عملی اور اصلاّح “ بیان کیے گئے ہیں۔(۳)نوراللغات میں اسلوب کے معنی بیان کرتے ہوئے یوں لکھا گیا ہے۔ ”اسلوب (عربی بالضم۔ مذکر) راہ، صورت، طرز، روش، طریقہ “(۴) فیروزاللغات(۵)اور فرہنگ عامر(۶) میں اسلوب کے ایک سے معنی لکھے گئے ہیں۔ ان دونوں لغات میں اس کے معنی ”طریقہ، روش“ اور اس کی جمع اسالیب لکھی گئی ہے۔ اسی طرح اظہر اللغات (۷)اور گلزار معانی(۸) میں بھی اس کے معنی ایک جیسے لکھے گئے ہیں۔ ان لغات میں اسلوب کے جو معنی لکھے گئے ہیں ان میں ”ڈھنگ، طریقہ، قاعدہ، دستور، راستہ“ شامل ہیں۔

اردو لغات میں اسلوب کے معنی اور مفہوم کے کھوج میں جب ہم جامع اللغات پر پہنچتے ہیں تو اس میں اسلوب کے معنی " ترتیب، ڈھنگ، سلسلہ انتظام، طریقہ، روش، طرز، طور، وضع، طرح، راستہ، راہ، طریقہ، کام کرنے کا چلن یا طریقہ، شکل وصورت، مرکبات کے آخیر میں جیسے خوش اسلوب" لکھے گئے ہیں۔[۹]

ان کے علاوہ اردو کی دیگر کئی لغات میں بھی اس لفظ کے معنی اور مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان تمام لغات میں اسلوب کے جو معنی بیان کیے گئے ہیں وہ تمام آپس میں کافی حد تک مماثلت رکھتے ہیں۔ اسلوب کے ان لغوی معنوں سے آگے بڑھتے ہوئے اس کے اصطلاحی مفہوم کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ لفظ ایک وسیع جہان معنی اپنے اندر بسائے ہوئے ہے۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات میں اس کے مفہوم کو بڑے واضح انداز میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق:

> "اسلوب Style سے مراد کسی ادیب یا شاعر کا وہ طریقہ، ادائے مطلب یا خیالات و جذبات کے اظہار و بیان کا وہ ڈھنگ ہے جو اس خاص صنف کی ادبی روایت میں مصنف کی اپنی انفرادیت (انفرادی خصوصیات) کے شمول سے وجود میں آتا ہے اور چونکہ مصنف کی انفرادیت کی تشکیل میں اس کا علم، کردار، تجربہ، مشاہدہ، افتاد طبع، فلسفہ حیات اور طرز فکر و احساس جیسے عوامل مل جل کر حصہ لیتے ہیں۔ اس لیے اسلوب کو مصنف کی شخصیت کا پرتو اور اس کی ذات کی کلید سمجھا جاتا ہے۔" [۱۰]

اس تعریف کو دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسلوب کی تشکیل میں کسی بھی مصنف کی شخصیت کا خاص عمل دخل ہوتا ہے۔ وہ اسلوب جو کسی مصنف کی خاص پہچان بن کر ابھرتا ہے اس کی تشکیل مصنف کی شخصیت کے دخول کے بغیر ممکن نہیں۔

اسلوب کو جب ہم ادبی یا تخلیقی سطح پر دیکھتے ہیں تو یہاں اسلوب سے ہماری مراد نثر اور شاعری دونوں میں متنوع ذرائع اظہار کی ہے۔ اسلوب میں لکھاری کی انفرادیت، اس کے افکار، داخلی محسوسات اور

ایقانات موجود ہوتے ہیں۔ اسلوب ایک طرح سے لسانی اظہار کے ذریعے سامنے آنے والا اندازِ تحریر ہے، جو کہ ڈکشن، انتخابِ الفاظ، رطوریقا، صنائع بدائع اور جدلیات جیسے دیگر ادبی اطوار کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ اس لیے زبان اسلوب کا انتہائی اہم جزو ہے جس کے ذریعے لکھاری اپنے بنیادی تخیلاتی ویژن کا ابلاغ قاری تک کرتا ہے۔ زبان کا معیار ہی وہ خاصیت ہے جسے اسلوب کہا جاتا ہے۔ یوں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلوب زبان کا وہ معیار ہے جو جامع انداز میں ان محسوسات یا خیالات، یا پھر محسوسات یا خیالات کے نظام کا ابلاغ کرتی ہے جو کسی لکھاری سے مخصوص ہوتے ہیں۔ اسلوب اس وقت کامل اور بے عیب تصور کیا جاتا ہے جب خیالات و افکار کا صریح ابلاغ ممکن ہوتا ہے یا منطقی ترتیب میں پیش کردہ خیالات کے انکشاف کا ہدف حاصل ہوتا ہے۔ تخلیق کار ردھم، پلاٹ، بیانیہ، کردار نگاری، پس منظر، مکالمہ، تمثیل، استعارہ اور ایسے دیگر وسیلوں کا استعمال کرتا ہے جو اس کے فن کارانہ عزم کا اظہار کرتے ہیں۔ تحریر کی ان متنوع صورتوں کا اطلاق تکنیک کہلاتا ہے۔ تکنیک کو آرٹ اور تجربے کے درمیان فرق کے طور پر سمجھا جاتا ہے، اور اسلوب ان کی درست پیش کش کا نام ہے۔ اس لیے یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اور یہ دونوں اطوارِ اظہار ہی تو ہیں۔ اسلوب اور تکنیک کا موزوں اور درست استعمال نہ صرف کسی ادب پارے کو معنی عطا کرتا ہے، بلکہ اسے قاری کے لیے دل چسپی کا سامان بھی بنا دیتا ہے۔ اسلوب اظہار کی وہ تکنیک ہے جس کی بہترین تفہیم یوں کی جاسکتی ہے کہ ہمارے لیے صرف یہ بات اہمیت نہیں رکھتی کہ کیا کہنا اور کب کہنا ہے بلکہ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ کیسے کہنا ہے۔ اور یہی "کیسے کہنا ہے؟" ہی اسلوب کا معیار مقرر کرتا ہے۔ اسلوب کا ماہرانہ استعمال کسی بھی تخلیق کو اس کی نامیاتی وحدت اور ہم آہنگی عطا کرتا ہے۔

اسلوب کے حوالے سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے تاریخی حقائق بیان کرتے ہوئے بڑی صراحت کے ساتھ اس کے مفاہیم کو اجاگر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اسلوب(style) کوئی نیا لفظ نہیں ہے۔ مغربی تنقید میں یہ لفظ صدیوں سے رائج ہے۔ اردو میں اسلوب کا تصور نسبتاً نیا ہے۔ تاہم "زبان بیاں"، "انداز"، "اندازِ بیاں"، "طرزِ تحریر"، "لہجہ"، "رنگ"، "رنگ سخن" وغیرہ اصطلاحیں اسلوب

یا اس سے ملتے جلتے معنی میں استعمال کی جاتی رہی ہیں۔ یعنی کسی بھی شاعر یا مصنف کے انداز بیاں کے خصائص کیا ہیں، یا کسی صنف یا ہئیت میں کس طرح کی زبان استعمال ہوتی ہے یا کسی عہد میں زبان کیسی تھی اور اس کے خصائص کیا تھے وغیرہ۔ یہ سب اسلوب کے مباحث ہیں، ادب کی کوئی پہچان اسلوب کے بغیر ممکن نہیں"۔ (۱۱)

گوپی چند نارنگ کے اس بیان سے جہاں اسلوب کی حوالے سے تاریخی آگاہی ہوتی ہے وہاں اس کے مفاہیم بھی واضح ہوتے ہیں۔ اسلوب کو انھوں نے تخلیق میں سامنے لائے گئے مواد کے اندازِ اظہار یا اندازِ بیان سے تعبیر کیا ہے۔ اور ادب کے لیے اس کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔

جس طرح ادب کی کوئی پہچان اسلوب کے بغیر ممکن نہیں اسی طرح ادیب کی پہچان بھی اس کے اسلوب کے بغیر محال ہے۔ کوئی بھی تخلیق کار جب تک اپنے اسلوب پر عبور حاصل نہیں کر پاتا تب تک اس کی تخلیق میں بیان کیے گئے خیالات، احساسات، جذبات اور تاثرات و مشاہدات خواہ کتنے ہی اعلیٰ درجے کے کیوں نہ ہوں وہ قارئین کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ ایک تخلیق کار کے لیے اپنی تخلیق میں اپنی ذات کو شامل کرنے سے اس تخلیق میں جان پڑتی ہے اور پھر اسلوب اس کی اس ذات کو اس کی تخلیق میں سے ہی سامنے لاتا ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد اسی بنا پر اسلوب کو انکشاف ذات قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگر استعارے کی زبان میں بات کی جائے تو خدا ذات ہے اور کائنات اسلوب! یہاں میں نے اسلوب کو انکشافِ ذات اور اظہار ذات کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔" (۱۲)

یوں اسلوب صرف اندازِ نگارش یا طرز تحریر ہی نہیں رہتا بلکہ انکشاف ذات کا ذریعہ بن جاتا ہے اور یہی انکشاف ذات کسی تخلیق کو عروج پر لے جانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

تخلیق کا اسلوب دراصل اس کے انفرادی طرزِ احساس کا اظہار ہے۔ اسے اظہار کی ذاتی انفرادیت بھی قرار دیا جاسکتا ہے جس کی سبیل سے ایک لکھاری کی شناخت ممکن ہوتی ہے۔ یوں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ''اسلوب شخصیت ہے'' تاہم یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کچھ لکھاری اس رائے کے قائل ہیں کہ ذاتی خیالات یا محسوسات کو کسی کی تحریر میں نہیں در آنا چاہیے۔ لیکن یہ تصور حقیقت سے بعید تر ہے، کیونکہ کسی لکھاری کا فن کارانہ اظہار کم و بیش اس کے ذاتی خیالات اور محسوسات کے رنگ میں ہی رنگا ہوتا ہے۔ اسلوب نامیاتی ہوتا ہے۔ یہ لباس نہیں بلکہ جسم کا گوشت پوست، ہڈیاں اور خون ہے۔ ایک لکھاری اس جذباتی عنصر کے ذریعے اپنے اتھاہ محسوسات کی ترسیل کرتا ہے جس سے قاری کے جذبات ان گنت ہوتے ہیں اور اسے اپنے محسوس ہوتے ہیں۔

ایک اچھے تخلیق کار کے لیے اسلوب کی لچک پر عبور حاصل کرنا ضروری ہے۔ اگرچہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تخلیق کار ہونے کے لیے خالص اسلوبیات دان ہونا ضروری ہے۔ اسے اپنی تکنیک کی پیش کش کے حوالے سے محتاط ہونا چاہیے اور یک رنگی سے گریز کرنا چاہیے۔ صرف اسی صورت میں اس کی تخلیق ممتاز مقام حاصل کر کے اس کی پہچان بن سکتی ہے۔ اسلوب ہی وہ ذریعہ ہے جو کسی تخلیق کار کو دوسروں سے ممیّز کرتا ہے۔ سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

> ''اسلوب سے مراد کسی لکھنے والے کی وہ انفرادی نگارش ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والوں سے ممیّز ہو جاتا ہے۔'' (۱۳)

اسلوب کسی تخلیق کار کو اس وقت ہی دوسروں سے ممیّز کر سکتا ہے جب اس اسلوب میں سے اس تخلیق کار کی ذات کا انکشاف ہو رہا ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تخلیق کار جب چاہتا ہے کہ اس کی پہچان ہو تو وہ کچھ تخلیق کرتا ہے۔ اب اس کی تخلیق کا اسلوب ہی یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس تخلیق کار کی کیا پہچان بنتی ہے۔ اسلوب کے ذریعے ہم صرف کسی تخلیق کو ہی نہیں سمجھتے بلکہ اسلوب اس تخلیق کے تخلیق کار کی پوری ذات کا عکس اور مطالعہ بن کر سامنے آتا ہے۔

تخلیق کار اور اسلوب کے تعلق کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر نے بڑی وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اسلوب ٹھوس، جامد، قطعی، غیر متحرک اور تغیر ناآشنا نہیں ہوتا۔ اسلوب تخلیق کار کی شخصیت کے نفسی محرکات کے ساتھ ساتھ موضوع کے تقاضوں اور تخلیق سے متعلق جمالیاتی معیاروں کی مناسبت سے چولا بلکہ اس چولے کا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ اسی لیے غزل اور قصیدہ یا مثنوی کے اسلوب میں فرق نظر آتا ہے۔'' (۱۴)

یوں دیکھا جائے تو اسلوب نہ صرف تخلیق کار کی پہچان بنتا ہے بلکہ مختلف اصناف ادب کی ہئیت متعین کرنے میں بھی اسلوب کا کلیدی کردار ہے۔ یہاں اسلوب بہت وسیع معنوں میں سامنے آتا ہے۔ تخلیق کار کی پہچان کے حوالے سے اسلوب عمودی اور افقی ہر دو حوالوں سے سفر کرتا ہے۔ افقی طور پر وہ مختلف تخلیق کاروں میں اس کے مقام کا تعین کرتا ہے کہ یہ تخلیق کار نثر یا نظم کی کس صنف میں طبع آزمائی کر رہا ہے اور جب یہ افقی سفر مکمل ہو جاتا ہے تو اسلوب کو عمودی سفر شروع ہو جاتا ہے کہ وہ تخلیق کار جس صنف میں طبع آزمائی کر رہا ہے اس صنف کے دیگر تخلیق کاروں میں اس کا مقام و مرتبہ کیا ہے یا وہ ان سے کس طریقے سے ممیز ہے۔ ان تمام امور کو جانچنے میں اسلوب اہم کردار ادا کرتا ہے۔ کوئی بھی تخلیق یا تخلیق کار اسلوب کے بغیر اپنی پہچان نہیں بنا سکتا۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خان اسلوب کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ادب میں اسلوب کی وہی حیثیت ہے جو انسانی وجود کے لیے روح کی ہے۔ جس طرح پتھر میں مجسمہ پوشیدہ ہوتا ہے اسی طرح ہر تحریر وجود میں آنے سے قبل اپنا اسلوب رکھتی ہے۔ جس دن پہلی تحریر وجود میں آئی اسی دن اسلوب نے بھی اپنے آنے کا اعلان کیا۔ اس کا مطلب ہوا کہ اسلوب سائے کی مانند تحریر کے عقب میں سفر کرتا نظر آتا ہے۔'' (۱۵)

اسلوب کے ذریعے ہی کسی ادیب کا جبلی انداز فکر سامنے آتا ہے۔ ادب کے تخیلات ، اس کا استدلال اس کے اس کے اسلوب میں منتقل ہو کر جب سامنے آتا ہے تو اس کی پہچان کا ذریعہ بننے کے ساتھ ساتھ اسے دوسروں سے ممیز بھی کرتا ہے۔ اسلوب میں وقت ، حالات اور جذبات واحساسات کے تحت تخلیق کار کی شخصیت میں آنے والی مختلف تبدیلیوں سے تبدیلی بھی واقع ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس عہد کی مجموعی صورت حال ، کسی مخصوص صنف کی ہئیت کے تقاضے ، سماجی واخلاقی روایات اور مختلف موضوعات بھی اسلوب کو متاثر کرتے ہیں۔ کیوں کہ تخلیق میں تخلیق کار صرف اپنی داخلی کیفیات و احساسات کو ہی پیش نہیں کرتا بلکہ خارجی عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ خارجی عناصر تخلیق کار کی داخلیت کے ساتھ مل کر ایک مزاج بناتے ہیں۔ یوں جب خارجی عناصر میں تبدیلی واقع ہو گی تو لازمی طور پر وہ تخلیق کار داخلیت کی سطح پر بھی اس سے متاثر ہو گا اور یہی تاثرات اسلوب کو بھی متاثر کریں گے۔ اس لیے کسی بھی تخلیق کے اسلوب کا جائزہ لیتے وقت اس کی داخلی کیفیات کے ساتھ ساتھ خارجی عناصر اور تبدیلیوں کو بھی مد نظر رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔

اسلوب کی تشکیل کہیں خلا میں ظہور نہیں پاتی۔ اس کی تشکیل تخلیق کے اندر سے پھوٹتی ایک ایسا اسلوب تشکیل دینا اور پھر اسے استعمال میں لانا جو حقیقی معنوں میں تخلیق کار کی پہچان بننے کے ساتھ اس تخلیق کو بھی ممتاز مقام پہ سرفراز کرے ، برسوں کی ریاضت کا کام ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر فوزیہ اسلم نے بڑی اہم بات کی ہے کہ:

> ''اسلوب ایک ادیب کی مسلسل ریاضت سے اس کی ذات کا حسن ، اس کی مخصوص لفظیات ، کمپوزیشن کا مخصوص طرز ، اس کے اطوار ، ایک خاص طرز کے فقرے ، اس کی موضوع کے ساتھ وابستگی (Commitment) اور پھر بار بار اس کا استعمال رفتہ رفتہ ایک طرز کو جنم دیتا ہے اور یہی اسلوب بن کر اس کی شخصیت کے ظہور کا سبب بن جاتا ہے۔'' [۱۶]

اسلوب تخلیق کار کی شخصیت کا عکاس ضرور ہوتا ہے لیکن یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انسانی شخصیت مختلف رنگ وروپ سے مزین ہے۔ اس کی کائنات اتنی وسیع ہے کہ اسے آسانی کے ساتھ سمجھنا اور سمجھانا مشکل ہے۔ انسانی شخصیت کو نہ تو مکمل طور پر ظاہر کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی مکمل طور پر چھپایا جاسکتا ہے۔ اس کا ظہور مکمل طور پر اسلوب میں بھی نہیں ہو گا۔ کسی بھی تخلیق کار کے محض اسلوب کو دیکھ کر یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اسی طرز کی شخصیت کا حامل ہے۔ اسلوب میں اس کی شخصیت کا ظہور ایک حد تک ہی ہو سکتا ہے اور وہ حد اس تخلیق کے تقاضے ہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک تخلیق کار اپنی تخلیقات میں اعلیٰ نظریات اور خیالات کو پیش کر رہا ہو لیکن عملی زندگی میں وہ ان خیالات و نظریات کے بارے میں ویسی رائے نہ رکھتا ہو۔ اس کی بڑی وجہ ہے یہ ہے کہ عملی زندگی اور تخلیقی زندگی کے تقاضے الگ الگ ہوتے ہیں۔ یہ تو درست اور لازم ہے کہ عملی زندگی کے اثرات تخلیق کار کی تخلیقی زندگی پر بھی پڑتے ہیں اور اس کے اسلوب کو بھی متاثر کرتے ہیں لیکن اس کی مکمل عملی زندگی اس کے اسلوب کی بنیاد پر اس کی تخلیقی زندگی قرار نہیں دی جاسکتی۔ تخلیق کے مختلف تقاضے اور خارجی حالات اسلوب کی تشکیل میں ضرور شامل ہوتے ہیں۔

یوں اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اسلوب کسی بھی تخلیق کار کے خیالات واحساسات کو ترسیل بخشتا ہے اور قارئین تک پہنچاتا ہے۔ جس تخلیق کار کا اسلوب جتنا سہل، رواں اور دلچسپ ہو گا اس کے خیالات و احساسات اتنی ہی آسانی سے قاری تک پہنچیں گے اور قاری ان کی تفہیم میں زیادہ دلچسپی لے گا۔ گویا کسی تخلیق کی کامیابی میں اس کا اسلوب اہم کردار ادا کرتا ہے۔

اسلوب ہی وہ فن ہے جس میں تخلیق کار مختلف تشبیہات و استعارات اور تراکیب سمیت دیگر فنی حربوں کے ذریعے اپنے خیالات و احساسات کی ترسیل کے لیے اپنے قلم کو آگے بڑھاتا ہے۔ اگر تخلیق کار اسلوب کے لوازمات سے ناواقف ہے اور اپنی تخلیق کا اسلوب رواں اور بہترین بنانے پر قدرت نہیں رکھتا تو اس کے خیالات خواہ کتنی ہی اعلیٰ سطح کے کیوں نہ ہوں اور ان خیالات کی تشکیل اس کے ذہن میں خواہ کتنے

ہی اہم واقعہ کے زیرِ اثر نہ ہوئی ہو وہ قاری کو متاثر کرنے میں کامیاب نہ ہو پائے گا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ قاری تک تخلیق کار کے خیالات و احساسات اس طرح پہنچنے لازم ہیں کہ ان میں ابلاغ کے مسائل پیدا نہ ہوں۔ تخلیق کار کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی تخلیق کی صنف کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنے اسلوب کی تشکیل ان خطوط پر کرے کہ قاری کی اس تخلیق میں دلچسپی نہ صرف برقرار رہے بلکہ وہ اس کے مفہوم تک بھی رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ تب جا کر ہی اس کی تخلیق میں جان پیدا ہو گی اور اس کی تخلیق اپنے معاصر ادب میں اپنا مقام بنا پائے گی۔

مختلف اصنافِ ادب کے اسلوب کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں جو اس صنف کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر داستان کا اسلوب افسانے سے مختلف ہو گا اور غزل اور شہر آشوب کے اسلوب میں فرق ہو گا۔ اسی طرح آپ بیتی یا خود نوشت کے حوالے سے دیکھا جائے تو آپ بیتی کے اسلوب کے بھی اپنے تقاضے ہیں جو کو پورا کرنا آپ بیتی نگار کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

آپ بیتی نگار کو اس امر کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ وہ خیالات سے زیادہ تجربات کو بیان کر رہا ہے اور تجربات بھی وہ جو اس کی اپنی ذات پر بیتے ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے اس پر لازم ہے کہ وہ ایسا اسلوب اختیار کرے کہ ان تجربات کی حقیقت نہ تو تبدیل ہونے پائے اور نہ ہی مسخ ہو۔ آپ بیتی نگار جو واقعات اور تجربات اپنی ذات کے حوالے سے بیان کر رہا ہوتا ہے وہ اسی سماج میں ہوئے ہوتے ہیں جس سے وہ زندگی کے مختلف مراحل میں منسلک رہا ہوتا ہے۔ ان واقعات کی تصدیق کے لیے اس سماج کے بہت سے لوگ موجود ہیں اس لیے آپ بیتی نگار کو اس امر کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کسی صورت بھی واقعات کے بیان میں دروغ گوئی سے کام نہ لے۔ افسانے اور ناول سمیت دیگر بہت سی اصناف ادب کے لکھاریوں کے سامنے بیان کرنے کو بہت کچھ ہوتا ہے۔ تخیلات، احساسات اور دیگر بہت سی چیزوں کو وہ مختلف انداز میں بیان کرنے کی اجازت رکھتا ہے جب کہ آپ بیتی نگار کے سامنے اس کا اپنا سماج اور وہ تجربات ہوتے ہیں جن سے وہ ساری زندگی گزرتا رہا ہوتا ہے۔ اسے ان تجربات کو ہی بیان کرنا ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان

تجربات کی نوعیت کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ ان تجربات میں ایسے تجربات بھی شامل ہوتے ہیں جو جذبات سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ بیتی نگار کو ان تجربات کے بیان کے لیے بھی خاص انداز اپنانا پڑتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ افسانے، ناول یا دیگر اصناف کے لکھاری ذاتی تجربے کو بھی سماجی واقعے میں بدلنے کی کھلی اجازت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کو مختلف اسلوب اور انداز کے ذریعے سماج کے قالب میں ڈھال سکتے ہیں جب کہ آپ بیتی نگار کو اس بات کی اجازت نہیں ہوتی۔ آپ بیتی نگار نے اپنی ذات کے جن تجربات، جذبات اور احساسات کو آپ بیتی میں بیان کیا ہوتا ہے اسے ان کا اعتراف بھی کرنا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اس کے ساتھ واقعہ ہوا ہے یا سماج کے اس واقعے نے اس پر یہ اثر ڈالا ہے۔ اس لیے آپ بیتی نگار کو ایسا اسلوب اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے جو حقیقی معنوں میں اس کی ذات کی عکاسی کرے۔ ایسے اسلوب کی تشکیل کی میں آپ بیتی نگار کے شخصی مزاج کو خاص عمل دخل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف آپ بیتی نگاروں کے ہاں یوں تو مختلف اسالیب ملتے ہیں لیکن ان تمام اسالیب میں ان کی اپنی شخصیت کا اور ان کے مزاج کا عمل دخل واضح نظر آتا ہے۔ ان کا یہی شخصی مزاج زندگی میں ان کی خاص پہچان بنا ہوتا ہے تو اسلوب میں بھی ان کی انفرادیت کا باعث بنتا ہے۔

## ب: "فرزندِ پاکستان" کا انداز بیان:

شیخ رشید احمد کی آپ بیتی "فرزندِ پاکستان" میں جہاں فکری حوالے سے پاکستانی سماج اور سیاست کی تصویر کشی ملتی ہے وہاں اس کے اسلوب اور فن کے حوالے سے بھی خاص دلکش اسلوب ملتا ہے۔ شیخ رشید احمد ایک مجلسی آدمی ہیں۔ ان کا حلقہ احباب نہ صرف بہت وسیع ہے بلکہ ان کے حلقہ احباب میں ہر طرح کے لوگ شامل ہیں۔ ان کا اپنا مزاج بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ وہ عملی زندگی میں بھی بات کو کھلے ڈھلے اور بے باک انداز میں بیان کرنے کی خاص صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ جو کہنا چاہتے ہیں بڑے بے باکانہ انداز میں کہہ دیتے ہیں اور پھر اس کہے پر قائم بھی رہتے ہیں۔ یہ خصوصیات ان کے اسلوب میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔

## تشبیہات، استعارت اور محاورات کا استعمال:

شیخ رشید احمد کے اسلوب میں تشبیہات و استعارات کو بھی خاص عمل دخل حاصل ہے۔ ان کی آپ بیتی "فرزندِ پاکستان" کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انہوں نے اسلوب کو دلچسپ بنانے کے لیے تشبیہات و استعارات نہ تو گھڑے ہیں اور نہ ہی شعوری طور پر ان کو استعمال کر کے آپ بیتی کو معتبر بنانے کی کوشش کی ہے بلکہ ان کے ہاں تشبیہات و استعارات کے استعمال کی نوعیت وہی ہے جو ان کی عام بول چال میں ہوتی ہے۔ یہ وصف اسلوبیاتی حوالے سے ان کی تحریر کو حقیقت کے قریب لے جاتا ہے۔

شیخ رشید احمد کے ہاں جو تشبیہات اور استعارات استعمال ہوئے ان تشبیہات اور استعارات کا استعمال انہوں نے نہ صرف ظاہری تشابہات کو سامنے رکھتے ہوئے کرتے ہیں بلکہ وہ کیفیات کی سطح پر اتر کر ان تشبیہات سے کام لیتے نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ غزل گو شعرا کی طرح شعوری طور پر تشبیہات استعمال نہیں کرتے بلکہ جس واقع کے جو اثرات ان پر پڑتے ہیں اور جو کیفیت وہ دیکھتے ہیں اسی کے مطابق خود ہی ان کی زبان سے کوئی تشابہ جملہ ادا ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے قاری ان کی تشبیہات سے کیفیات کے حوالے سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ ان کے ہاں عام روش سے ہٹ کر تشبیہاتی انداز ملتا ہے جو ان کے اسلوب کی سطح پر کیے جانے والے تجربات کی وجہ سے ہے۔ ان کے ہاں تشبیہات اور استعارات کے منفرد انداز میں استعمال کی وجہ سے ان کے اسلوب میں ایک نئی جان پڑتی نظر آتی ہے۔ قاری کے لیے یہ ایک ایسا نیا اسلوب بن کر سامنے آتا ہے جس میں وہ خود کو محو پاتا ہے۔ ان کے اسلوب میں استعمال ہونے والی تشبیہات اور استعارات ان کے گہرے مطالعے اور وسیع مشاہدے کے غماز بن کر ابھرتے ہیں۔ وہ تشبیہات کا استعمال کرتے وقت ایک پورا منظر تخلیق کر دیتے ہیں جس سے ان کا اسلوب میں قاری کی دلچسپی بڑھتی چلی جاتی ہے۔

ان کی آپ بیتی " فرزندِ پاکستان " میں بہت سے ایسے استعارے اور محاورات استعمال ہوئے جو اہل زبان کے ہاں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ ان اہم محاورات اور استعارات کو بڑی روانی کے ساتھ استعمال کرتے چلے جاتے ہیں اور کہیں بھی قاری کے لیے ابلاغ کے مسائل پیدا نہیں ہونے پاتے۔ اس کی ایک مثال ذیل کے اقتباس میں دیکھی جاسکتی ہے:

"نواز شریف کی کابینہ میں ان کی کور سروس کے بعض لوگ موجود تھے اور دو توپیں انہوں نے سرعام رکھی ہوئی تھیں۔ ایک اجلال حیدر زیدی اور دوسرے روئیداد خان۔ وزارت خزانہ ان کی جیب کی گھڑی تھی۔ " (۱۷)

اس اقتباس میں دیکھا جائے تو شیخ رشید احمد نے انتہائی مہارت سے اجلال حیدر زیدی اور روئیداد خان کے لیے " دو توپیں " کا استعارہ استعمال کر کے ان کے مزاج کو بڑی مہارت سے سامنے لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ دونوں ایسی شخصیات تھیں جو نواز شریف کے حق میں رطب اللسان رہتے تھے اور ہر موقع پر نواز شریف کی پالیسیوں کا بھرپور دفاع کرنے کے ساتھ ساتھ مخالفین پر لفظی گولہ باری کے حوالے سے بھی خاص اہمیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ رشید احمد نے ان کو " دو توپیں " کہا۔ اس سے ایک طرف تو تحریر میں قاری کی دلچسپی میں اضافہ ہوا ہے تو دوسری طرف قاری ان دونوں شخصیات کے حقیقی مزاج تک پہنچنے میں بھی کوئی دقت محسوس نہیں کرتا۔

اسی اقتباس میں شیخ رشید احمد نے " جیب کی گھڑی ہونا " کے محاورہ کو بھی بڑی خوب صورتی سے استعمال کیا ہے۔ جیب کی گھڑی ہونا سے عام طور پر کسی چیز پر مکمل کنٹرول ہونا مراد لیا جاتا ہے۔ نواز شریف کے دورِ حکومت میں وزات خزانہ مکمل طور پر ان کے ماتحت تھی اور وہ اپنی مانیاں کرنے میں آزاد تھے۔ اسی مناسبت سے شیخ رشید احمد نے وزارتِ خزانہ کو نواز شریف کی جیب کی گھڑی قرار دیا ہے۔

بعض اوقات وہ رسمی انداز کی ایسی تشبیہات بھی استعمال کر جاتے ہیں جو اہل زبان کے ہاں بھی عام پائی جاتی ہیں اور سماج میں ان کی حیثیت ضرب المثل کی سی صورت اختیار کر چکی ہوتی ہے۔ایسی تخلیقات سماج میں عام استعمال کی جاتی ہیں اور لوگوں کی زبان پر اس قدر رواں ہوتی ہیں کہ وہ عام بول چال میں بھی ان کو استعمال کرتے رہتے ہیں۔ایسی تشبیہات تخلیق کار کو عام قاری سے جوڑنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ایسی تشبیہات کے استعمال کے حوالے سے ان کی آپ بیتی ''فرزندِ پاکستان'' میں انھوں نے بہت کام لیا ہے۔

ان کے ہاں تشبیہات کے استعمال میں خاصا تنوع پایا جاتا ہے، بعض اوقات وہ سماجی صورت حال میں سے بھی کوئی نہ کوئی تشبیہ اچک لیتے ہیں جو ان کے مدعا کو زیادہ بہتر ابلاغ عطا کرتی ہے۔

تشبیہات کی طرح شیخ رشید احمد نے ''فرزندِ پاکستان'' میں محاورات سے بھی خاص کام لیا ہے۔ان کے ہاں عام فہم اور رواں محاورات استعمال ہوئے جو ان کے اسلوب میں روانی پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔یہ ایسے محاورات ہیں جو سماج میں عام طور پر بولے جاتے ہیں اور زبانِ زد عام ہیں یہی وجہ ہے کہ ان محاورات کو لوگ آسانی سے سمجھ کر ان کے مفہوم تک پہنچ جاتے ہیں۔شیخ رشید احمد کی فرزندِ پاکستان سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''میں نے سب سے کہہ دیا تھا کہ میں تو انتخابات کے لیے اپنے حلقے میں جارہا ہوں، میں آپ سے یہ کہتا رہا کہ ملازمتوں پر سے پابندی ختم کر دیں لیکن آپ نے میری ایک نہ سنی۔'' (۱۸)

یہاں ''ایک نہ سنی'' ایسا محاورہ استعمال ہوا ہے جو ہماری روز کی بول چال میں شامل ہے اور ہر کوئی آسانی سے اس کے مفہوم تک پہنچ جاتا ہے کہ ایک نہ سنی کا مطلب نہ سننا نہیں بلکہ نہ ماننا ہے اور شیخ رشید احمد بھی یہاں اپنے ساتھی وزرا کو یہی کہہ رہے ہیں کہ ملازمتوں پر سے پابندی کا خاتمے کے حوالے سے کی گئی میری باتوں کو نہ مانا گیا اور آج نوبت یہاں تک آگئی کہ عوامی رائے کو ہمارے مخالف استعمال کر کے اقتدار

کا بستر گول کیا جارہا ہے۔ ان کے ہاں محاورات کا استعمال تحریر کو بارعب نہیں بناتا بلکہ تحریر میں روانی قائم رکھتے ہوئے اس کو معنوی سطح پر خاصی وسعت عطا کرتا ہے۔ اسی طرح ایک اور جگہ انہوں نے ایک اور محاورے کو یوں استعمال کیا ہے:

"مجھے ایک دن اعتماد میں لے کر نواز شریف نے میر شکیل الرحمان کے پاس خصوصی پیغام دے کر بھیجا کہ وہ کچھ عرصے کے بعد آٹھویں ترمیم کے خلاف اسحاق خان سے دو دو ہاتھ کرنے والے ہیں۔" (۱۹)

اس اقتباس میں " دو دو ہاتھ کرنا" محاورے کو اس انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ قاری اصل مفہوم تک آسانی سے رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیخ رشید احمد کے ہاں محاورات کا جو استعمال ہوا ہے وہ ان کی گفتگو کا حصہ ہے۔ انہوں نے شعوری کوشش نہیں کی تحریر کو محاورات سے مزین کرنے کی بلکہ اپنی روز کی گفتگو میں ہی اپنی سیاسی اور سماجی زندگی کی روداد بیان کی ہے جس کی وجہ سے ان کی تحریر میں قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔

## اشعار کا استعمال :

شیخ رشید احمد ایک خوش مزاج انسان ہیں۔ ان کی باتوں سے کہیں بھی اکتاہٹ یا بوریت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ وہ بڑے پر جوش انداز میں بات کرتے ہیں اور بات کرنے کے دوران میں ان کے ہاں کہیں کہیں اشعار کا استعمال ان کی باتوں میں وزن پیدا کرنے کے ساتھ سننے والوں کے دل و دماغ میں مسرت بھی بھر دیتا ہے۔ ان کا یہی انداز ان کی تحریر میں بھی نظر آتا ہے۔ " فرزندِ پاکستان" میں مختلف واقعات کا بیان کرتے ہوئے انھوں نے اشعار کا استعمال بھی بڑی خوب صورتی سے کیا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

”جناب والا: میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیں اس قوم کو اعتماد میں لینا ہے۔ ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے۔ قوم ایک دن کے لیے نہیں ہوتی یہ انہوں نے چھٹا پانچ سالہ منصوبہ بنایا ہے، آج میرا خیال ہے جنابِ سپیکر ۸۵ء ہو چکا ہے اور ۶۰ فی صد کام ویسے کا ویسا ہی پڑا ہے۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں

رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن [۲۰]

یوں انھوں نے پانچ سالہ منصوبہ کے ذکر کے ساتھ اس شعر کا استعمال کر کے اس حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ جو پانچ سالہ منصوبے بنائے جا رہے ہیں اور ان کا انحصار قرضوں کے حصول پر کیا جا رہا ہے کہ یہ منصوبے عوام کا اعتماد حاصل کرنے میں ناکام رہیں گے اور قرض کی اس مے سے کبھی رنگ نہیں ابھرنے والے۔ یہ ان کی اسمبلی میں کی گئی تقریر ہے جو انھوں نے جوں کی توں اپنی آپ بیتی ”فرزند پاکستان“ میں تحریر کر دی ہے۔ اسمبلی میں شیخ رشید کے بہت چرچے ہیں اور ان کی یہ رنگین بیانی ان کی بات میں لوگوں کی دلچسپی بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

## تراکیب:

شیخ رشید احمد کی آپ بیتی فرزندِ پاکستان میں بہت سی تراکیب کا استعمال بھی بڑی خوب صورتی سے ہوا ہے۔ ترکیب کے استعمال میں بھی انہوں نے اپنی روزمرہ کی گفتگو کو ہی سامنے رکھا ہے۔ وہ غیر ضروری یا شعوری طور پر تراکیب کو متن میں ٹھونس کر تحریر کو بارعب بنانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ان کی بول چال میں جو تراکیب استعمال ہوتی ہیں وہی ان کی تحریر میں بھی نظر آتی ہیں۔ اس کی ایک مثال ”فرزندِ پاکستان“ سے ملاحظہ ہو:

”میں نے کسی امریکن سے ملاقات کی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا، خود ان کے اعلیٰ حکام کشمیر کے مسئلہ میں مجھ سے میٹنگ کر رہے تھے۔“ [۲۱]

یہاں میٹنگ در میٹنگ کی خوب صورت تراکیب انگریزی اور اردو الفاظ کے استعمال سے بڑی خوب صورتی سے استعمال ہوئی ہے جو اس امر کا اظہار کر رہی ہے کہ امریکن حکام شیخ رشید احمد سے کشمیر کے مسئلے پر میٹنگیں کیے جا رہے تھے۔ یہ ایسی ترکیب ہے جو اردو میں عام طور پر مستعمل نہیں ہے بلکہ شیخ رشید احمد نے اپنی بول چال میں ہی اس کو استعمال کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ہاں تراکیب گھڑنے کا انداز نہیں ملتا ہے بلکہ وہ روز مرہ گفتگو ہی تحریر میں لاتے ہیں۔ اب اس گفتگو میں جس زبان کا جو بھی لفظ کسی دوسری زبان کے الفاظ کے ساتھ مل کر بھی ترکیب بنا دے ان کی تحریر میں وہ ترکیب نہ تو ابلاغ کے مسائل پیدا ہونے دیتی ہے اور نہ ہی کوئی اور ایسی صورت حال سامنے آتی ہے کہ قاری ان بدیسی زبانوں کے الفاظ کے ملنے والی تراکیب سے مصنف کے مدعا تک نہ پہنچ پائے، بلکہ ایسی تراکیب ان کی بول چال اور اسلوب کو حقیقی بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

شیخ رشید احمد کی اس آپ بیتی " فرزند پاکستان "کا فنی اور اسلوبیاتی جائزہ بتاتا ہے کہ انہوں نے ایک با قاعدہ ادبی مصنف نہ ہونے کے باوجود فرزند پاکستان کو فنی اور اسلوبیاتی حوالے سے خاصا کامیاب بنایا ہے۔ ان کی یہ آپ بیتی جہاں ایک طرف فکری حوالے سے پاکستان کی سیاست اور سماج کی عکاسی میں اہم کردار ادا کرتی ہے وہاں فنی حوالے سے بھی ایک کامیاب آپ بیتی قرار پاتی ہے۔ شیخ رشید احمد ایک مجلسی آدمی ہیں لوگوں سے ان کے گہرے روابط ہیں اور سیاسی شخصیت ہونے کی وجہ سے ان کا سماج سے بھی گہرا تعلق ہے۔ ان کے حلقہ احباب میں ہر طرح کے لوگ شامل ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان میں مختلف عناصر کی آمیزش دکھائی دیتی ہے۔ وہ روز مرہ کی گفتگو میں بھی ایسی ہی زبان استعمال کرتے ہیں جو ان کی آپ بیتی میں نظر آتی ہے۔ یوں ان کی آپ بیتی کی زبان ان کے ذہن اور خیالات کی ترجمانی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی آپ بیتی کے لسانی خصائص کو بھی سامنے لاتی ہے۔ اس آپ بیتی کی زبان اس کے مصنف کے مزاج سے ہم آہنگ دکھائی دیتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ نہ صرف مکمل طور پر کہہ گیا ہے بلکہ قارئین تک اس مدعا کے پہنچنے میں ابلاغ کے بھی کوئی مسائل پیدا نہیں ہوئے اور قارئین بڑی آسانی کے ساتھ اس کے مافی الضمیر تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یوں یہ آپ بیتی فکر کے ساتھ ساتھ فنی حوالے سے بھی ایک کامیاب آپ بیتی قرار پاتی ہے۔

## ج: "ہم بھی وہاں موجود تھے" کا فنی و اسلوبیاتی مطالعہ:

جنرل ریٹائرڈ عبد المجید ملک کی آپ بیتی "ہم بھی وہاں موجود تھے" پاکستان کی سیاسی، عسکری اور سماجی صورت حال کے حوالے سے ایک اہم دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ اس آپ بیتی میں یوں تو انھوں نے اپنے حالات زندگی بیان کیے ہیں لیکن اپنی زندگی کے تجربات بیان کرتے ہوئے انھوں نے ۱۹۱۹ء سے لے کر بیسویں صدی کے اواخر تک کی سماجی، عسکری اور سیاسی صورت حال کا بہترین نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ اس آپ بیتی کے فکری محاسن اور موضوعات پر پچھلے ابواب میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے یہاں موضوع کی حدود کا خیال رکھتے ہوئے اس آپ بیتی کے فن اور اسلوب کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

عبد المجید ملک کا تعلق آرمی سے رہا ہے اور بعد میں وہ پاکستان کی سیاست میں بھی خاصے متحرک رہے ہیں اور مختلف سیاسی عہدوں اور انتظامی امور میں شامل رہے ہیں۔ انھوں نے اس کتاب میں اپنے زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے ان سب عہدوں اور ان سے وابستہ دیگر افراد کے حوالے سے بھی سیر حاصل بحث کی ہے لیکن یہ ان کے اسلوب کا بڑا کمال ہے کہ زندگی کے مختلف واقعات اور مختلف ذمہ داریوں کے بیان کے باوجود ان کی اس آپ بیتی کی تحریر میں کمال کا ربط دکھائی دیتا ہے۔ ان کی اس آپ بیتی کا مطالعہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کی تحریر پڑھتے ہوئے قاری کو کہیں بھی نہ تو تشنگی کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی اس بات کا کوئی شائبہ تک ہوتا ہے کہ واقعات کا آپس میں ربط ٹوٹ گیا ہے۔ تقریباً سو سال تک کے سیاسی، سماجی اور عسکری واقعات جن میں تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت، دو ملکوں کا قیام، تاریخ کی بڑی بڑی جنگیں اور مارشل لاء سمیت عالمی سطح پر بھی ہولناک تباہیوں کے واقعات ہوئے ہوں ایسی ہنگامہ خیز صدی کا بیان ایک کتاب میں انتہائی ربط کے ساتھ اس طرح کرنا کہ تمام واقعات آنکھوں کے سامنے گھومتے دکھائی دیں، خاصا محنت طلب کام ہے۔ عبد المجید ملک کی اس آپ بیتی کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے یہ کارہائے نمایاں بڑی کامیابی سے سر انجام دیا ہے اور کہیں بھی اس آپ بیتی میں واقعات کے تسلسل اور ربط میں کوئی جھول دکھائی نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ قاری کی اس آپ بیتی میں دلچسپی بڑھتی چلی جاتی ہے۔

زبان وبیان کا کسی بھی تخلیق میں اہم کردار ہوتا ہے۔ایک تخلیق کار اپنی تخلیق میں جو زبان استعمال کرتا ہے وہ اس کے مافی الضمیر کو بیان کرنے میں خاص حصہ لیتی ہے۔ زبان کی سلاست اور روانی کسی بھی تخلیق کو کامیاب بنانے اور اس میں قاری کی دلچسپی بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔اس حوالے سے دیکھا جائے تو عبدالمجید ملک کی آپ بیتی '' ہم بھی وہاں موجود تھے'' میں زبان کا استعمال انتہائی خوب صورت ہوا ہے۔انھوں نے بہت سے عسکری، سیاسی اور سماجی واقعات کو بیان کرتے ہوئے ایسی زبان استعمال کی ہے جو سلیس اور رواں ہونے کے ساتھ ساتھ جامعیت کے وصف سے بھی مالا مال ہے۔ان کی تخلیق میں استعمال ہونے والی زبان میں دروغ گوئی یا مبالغہ نہیں۔ کفایت لفظی ان کی اس تخلیق کا اہم وصف بن کر ابھرتی ہے۔ان کے ہاں کم لفظوں میں بڑی بات اور بعض اوقات تو مختصر الفاظ میں بہت بڑا فلسفہ حیات یا زندگی کا تجربہ بھی بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔اس ایک مثال ہجرت کے واقعات کے بیان سے ملتی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کے وقت انتہائی نامساعد اور ناخوشگوار حالات میں جہاں لوگ ایک طرف ایک دوسرے کی مدد کر رہے تھے وہاں دوسری طرف بہت سے لوگ لوٹ مار میں بھی مصروف تھے اور جان مال سب داؤ پر لگ چکے تھے۔ذاتی ہوس اور حرص نے انسانیت کو برباد کر کے رکھ دیا تھا۔سماج میں متضاد حالات پیدا ہو چکے تھے۔ان متضاد حالات کا بیان عبدالمجید ملک نے یوں مختصر مگر جامع الفاظ میں کیا ہے :

> '' قربانی ایک ایسی مثالیں جو صرف کتابوں میں ہی پڑھی تھیں اور خود غرضی کے وہ واقعات جو انسانی فطرت کا خاصہ ہیں، نگاہوں کے سامنے تھے۔'' (۲۲)

تخلیق کار جب کوئی تخلیق لکھ رہا ہوتا ہے تو مختلف حربوں سے وہ اپنے تجربات اور احساسات صفحہ قرطاس پر منتقل کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے اس طریقے سے جہاں اس کے خیالات کی ترسیل میں آسانی پیدا ہوتی ہے وہاں اس کی تحریر میں بھی نکھار پیدا ہو جاتا ہے۔ کوئی تخلیق کار ان فنی حربوں کو جتنی کامیابی سے استعمال کرتا ہے اتنی ہی اس کی تحریر نکھرتی چلی جاتی ہے اور قاری اس کی تحریر کے سحر میں گرفتار ہو کر رہ جاتا ہے۔

فن اور اسلوب کی سطح پر ایک تخلیق کار جو حربے استعمال کرتا ہے ان میں سے ایک اہم حربہ مختلف چیزوں کو دوسری چیزوں کے ساتھ تشبیہاتی انداز میں بیان کرنے کا حربہ ہے۔ تخلیق کار مختلف تشبیہات استعمال کر کے ایک طرف اپنی تحریر میں دلکشی اور خوب صورتی پیدا کرتا ہے تو دوسری طرف قاری کے لیے اس تحریر میں دلچسپی کے امور بھی پیدا ہونے لگتے ہیں۔

عبدالمجید ملک نے اس آپ بیتی میں تشبیہات کا بڑی خوب صورتی سے استعمال کیا ہے۔ تشبیہات کے استعمال سے ان کی تحریر میں جان سی پڑتی نظر آتی ہے اور اس کی تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ تشبیہات کا استعمال کرتے ہوئے اس بات کو خاص طور پر سامنے رکھتے ہیں کہ ان کی استعمال کردہ تشبیہ سماج سے نہ صرف ہم آہنگی رکھتی ہے بلکہ سماج کے لوگ اس کو سمجھنے میں کوئی دقت بھی محسوس نہ کریں۔ پاکستان کے سیاسی حالات بیان کرتے ہوئے وہ جب جنرل ایوب کی طرف سے لگائے گئے مارشل لاء کے دور تک پہنچتے ہیں تو جنرل ایوب کی طرف سے سکندر مرزا سے استعفیٰ لینے کے واقعے کی وجوہات کو یوں تشبیہاتی انداز میں بیان کرتے ہیں:

> ”جب مارشل لاء لگایا گیا تو اس وقت سکندر مرزا اور ایوب خان میں پرانی رفاقت قائم تھی اور دونوں کو اس رفاقت کا پاس تھا مگر مارشل لاء کے پہلے ہی دن سے اس دوستی میں دراڑیں پڑنا شروع ہو گئیں، کیونکہ کہ دو تلواروں کا ایک میان میں سمانا ناممکن تھا۔“ (۲۳)

”ایک میان میں دو تلواروں کا سمانا“ ایک ایسی تشبیہ ہے جو عبدالمجید ملک کی انفرادیت کو ظاہر کرتی ہے۔

عام طور پر ایسی صورت حال کے لیے ”جنگل میں دو شیر“ یا دیگر تشبیہات استعمال کی جاتی ہیں لیکن عبدالمجید ملک نے جو تشبیہ استعمال کی ہے اس میں ان کے شخصی مزاج کا خاص عمل دخل نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے فوج کے اعلیٰ عہدوں پر خدمات سرانجام دیں اس وجہ سے ان کے دل و دماغ پر فوج

کا خاصا اثر تھا۔ یہاں دو تلواروں اور میان کے الفاظ استعمال کر کے انھوں نے جو تشبیہاتی انداز اختیار کیا ہے وہ ایک طرف تو جنرل ایوب اور سکندر مرزا کے درمیان پائی جانے والی رقابت کو ظاہر کرتا ہے تو دوسری طرف عبدالمجید ملک کے شخصی مزاج کا آئینہ بھی بن کر ابھرا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی تحریر میں ان کی ذات کسی نہ کسی طرح سے جھلکتی لازمی دکھائی دیتی ہے۔

عبدالمجید ملک صورت حال کے مطابق تشبیہ استعمال کرنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ پاکستان میں سیاسی افراتفری اور اس کے نتیجے میں مختلف وزرائے اعظم کی تبدیلی کوئی اچھی روایت نہیں تھی۔ اس سے جہاں ایک طرف انتظامی امور میں خلل واقع ہوتا رہا ہے وہیں لوگوں کا اپنے ووٹ کے استعمال کے بارے میں بھی یہ دکھ سماج میں سامنے آتا رہا ہے۔ لوگوں کو اس بات کا شدید رنج رہا ہے کہ عوام کے پیسے کے استعمال سے جب عوام کے ووٹوں سے کوئی حکومت منتخب ہوتی ہے تو اسے اپنی مدت پوری نہیں کرنے دی جاتی۔ اس کے علاوہ محلاتی سازشوں کے نتیجے میں وزرائے اعظم کی تبدیلی بھی کوئی لائق تحسین امر نہیں گردانا جاتا۔

دوسری طرف ان وزرائے اعظم کی تبدیلی اور نئے وزیر اعظم کا انتخاب بھی عوامی رائے کی بجائے ذاتی پسند و ناپسند کی بنیاد پر ہوتا رہا اور یہ ذاتی پسند ناپسند کا معیار قابلیت کم اور چاپلوسی زیادہ تھی۔ جو سیاست دان زیادہ تیز اور تعلقات بنانے میں زیادہ ماہر ہوتا وہ اعلیٰ وزارتوں کے حصول میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ عبدالمجید ملک نے اس صورت حال کو "میوزیکل چیئر" سے یوں تشبیہ دی ہے:

> "۱۹۴۸ء میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کی وفات اور ۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد صدارت اور وزارت عظمیٰ کے عہدوں پر "سیاسی میوزیکل چیئر" کا کھیل کھیلا گیا۔" (۲۴)

یہاں میوزیکل چیئر کی تشبیہ خاص معنویت کی حامل ہے۔ میوزیکل چیئر میں ایک تو وہ کامیاب قرار پاتا ہے جو میوزک کی آواز پر کان رکھتا ہے اور دھیان اس اسی طرف ہوتا ہے جہاں سے آواز آرہی ہوتی ہے، سیاست میں بھی ایسی ہی روش قائم رہی کہ وزارتوں کے حصول میں کامیاب ہونے والوں کا دھیان اسی طرف رہتا تھا جہاں سے وزارتوں کی منظوری ہونی ہوتی تھی۔ دوسری طرف میوزیکل چیئر میں کامیاب

ہونے والوں کی طرح وزارتوں میں کامیاب ہونے والے لوگ بھی تیز طرار ہی ہوتے ہیں تبھی وہ اپنے جال میں لیڈروں تک کو پھنسا کر وزارت اور مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یوں عبدالمجید ملک نے یہاں یہ تشبیہ بڑی خوب صورتی سے استعمال کرتے ہوئے سیاسی منظر نامے کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے بظاہر تو صرف وزارت عظمیٰ اور صدارت کی بات کی ہے لیکن حقیقت میں پورا سیاسی منظر نامہ ہی اسی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالمجید ملک کو زبان وبیان پر خاص عبور حاصل تھا اور وہ حالات کے مطابق منفرد تشبیہات استعمال کرنے پر خاص قدرت رکھتے تھے۔

تشبیہ کے ساتھ ساتھ استعارہ بھی اس تحریر کو خوب صورت اور زیادہ بامعنی بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ عبدالمجید ملک نے اپنی آپ بیتی میں جہاں تشبیہات سے خوب کام لیا ہے وہاں انہوں نے بہت سے استعارات بھی استعمال کیے ہیں۔ استعارہ استعمال کرنے کے عمل میں ان کے ہاں کوئی شعوری کوشش نظر نہیں آتی بلکہ ان کے ہاں استعارات کا استعمال ان کی روزمرہ زندگی کی بول چال کی عکاسی کرتا ہے۔ انہوں نے ایسے استعارات استعمال کیے ہیں جو لوگ عام استعمال کرتے اور روانی سے بولتے رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ استعارات کے استعمال سے ان کی تحریر میں کوئی بوجھل پن یا رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی بلکہ ان کے استعمال کیے گئے استعارات تحریر کو خوب صورتی عطا کرنے کے ساتھ معنوی حوالے سے بھی اس میں وسعت پیدا کرتے ہیں۔

عبدالمجید ملک کے ہاں استعارات کے استعمال میں بھی تشبیہات کی طرح ان کی فوجی زندگی جھلکتی نظر آتی ہے۔ انہوں نے ایسے استعارات استعمال کیے ہیں جو فوجی زبان میں عام بولے جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال " مالِ غنیمت " ہے جسے فوجی زندگی میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس لفظ کو وہ استعارے کے طور پر یوں استعمال کرتے ہیں:

> "میں دیگر دو افسران کے ہمراہ کاکول سے ایک خستہ سرکاری گاڑی میں راولپنڈی پہنچا اور ہم نے ڈی اے وی کالج سے وہ " مالِ غنیمت " حاصل کیا جو بلیک بورڈ، چاک، فائلوں اور دیگر سامان پر مشتمل تھا۔" (۲۵)

یہاں بچے کھچے سامان کے لیے ''مالِ غنیمت'' کا استعارہ عبدالمجید کے فوجی ذہن کو ظاہر کرتا ہے۔ انہوں نے بعض ایسے استعارے بھی استعمال کیے ہیں جو انتہائی خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ متعلقہ جگہ سے ان کی انسیت اور لگن کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔

پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول کا شمار دنیا کی بہترین ملٹری اکیڈمیز میں ہوتا ہے۔ اس اکیڈمی نے عسکری حوالے سے دنیا بھر میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ اس کے پیچھے اصل میں پاک فوج کے جوانوں اور افسران کی شبانہ روز محنت کا خاص عمل دخل ہے۔ جس کی بدولت اس کو یہ عالمی معیار نصیب ہوا ہے۔ عبدالمجید ملک نے بھی عسکری ملازمت کے دوران میں اس اکیڈمی میں خدمات سرانجام دیں اور یہاں کے امور میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ انہیں اس اکیڈمی سے خاص انس حاصل تھا یہی وجہ ہے کہ وہ اس کا نام بڑی عقیدت اور احترام سے لیتے ہیں۔

عبدالمجید ملک کی پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول سے لگن اور انسیت کا بیان ان کی آپ بیتی میں بھی ملتا ہے جہاں وہ اس اکیڈمی کے لیے استعاراتی انداز استعمال کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

> ''میں جب پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول کے عالمی معیار کو دیکھتا ہوں تو یہ سوچ میرے دلی سکون کا باعث بنتی ہے کہ اس گلستان کی تزئین میں ہمارا خون بھی شامل ہے اور اس تناور درخت کی آبیاری کی سعادت ہمیں بھی حاصل ہے۔'' (۲۶)

یہاں پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول کے لیے گلستان اور تناور درخت کے استعارے استعمال کر کے جنرل عبدالمجید ملک نے اس ادارے سے اپنے قلبی تعلق کو واضح کیا ہے اور اس سے لگن اور انس کا اظہار کیا ہے۔

تحریر کو بامعنی بنانے اور اس میں حسن پیدا کرنے کے لیے ایک اور اہم حربہ جو تخلیق کار استعمال کرتے ہیں وہ تحریر میں مختلف محاوروں کا استعمال ہے۔ محاورے عام بول چال میں بھی لوگوں کی زبان پر ہوتے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ محاورہ اپنے حقیقی معنوں کی بجائے مجازی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور ان مجازی معنوں کے ذریعے تخلیق کار ایک محاورے سے کئی کام لے کر اپنا مدعا آسانی سے بیان کرتا چلا جاتا ہے۔

محاورے کا استعمال جہاں تحریر کو بامعنی بناتا ہے وہاں اس کے استعمال میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر محاورہ درست اور برمحل استعمال نہ کیا گیا تو تحریر کے معنی بدل بھی سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر کوئی ایسا محاورہ استعمال کر دیا جائے جو لوگوں میں عام طور پر مستعمل نہ ہو تو اس سے ابلاغ کے مسائل بھی پیدا ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ اس لیے محاورات کے استعمال میں تخلیق کار کو خاص احتیاط برتنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

عبدالمجید ملک کی آپ بیتی ''ہم بھی وہاں موجود تھے'' کا جب ہم فنی اور اسلوبیاتی حوالے سے جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کے ہاں محاورات کا استعمال بھی بڑی خوب صورتی سے اور برمحل ہوا ہے۔ انھوں نے ایسے محاورے استعمال کیے ہیں جو زبان زدِ عام ہونے کی وجہ سے سماج میں خاصے مقبول ہیں اس کے علاوہ ان کے استعمال کردہ محاورات تحریر میں برمحل ہونے کی وجہ سے خاصی دلچسپی کا باعث بھی بنتے ہیں۔ ایک جگہ محاورے کا استعمال کرتے ہوئے یوں تحریر کو مزین کرتے ہیں:

> ''تمام منصوبہ ساز جرنیل ذہنی دباؤ کا شکار تھے اور جلد از جلد اس کام کو نمٹانا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں راز داری اور احتیاط کے ساتھ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھا جارہا تھا۔'' (۲۷)

''قدم پھونک پھونک'' کر رکھنا انتہائی احتیاط سے کسی کام کو انجام دینے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ محاورہ سماج میں بھی عام مستعمل ہے اور اسی مفہوم کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں یہ محاورہ استعمال کرنے سے جہاں ایک طرف تحریر میں خوب صورتی پیدا ہوئی ہے وہاں دوسری طرف اس میں معنوی وسعت بھی پیدا ہوئی ہے۔

عبدالمجید ملک نے اپنی آپ بیتی میں عام فہم محاورات کثرت سے استعمال کیے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا نہ صرف مطالعہ وسیع تھا بلکہ زبان و بیان پر بھی ان کی خاصی مضبوط گرفت تھی۔ اس کتاب میں ایک اور جگہ ایک عام استعمال کے محاورے سے یوں وہ تحریر میں رنگ بھرتے ہیں:

"جنگ کے بعد کے حالات و اثرات نے حکومت پر ایوب خان کی گرفت کمزور کر دی۔ معاہدہ تاشقند ہوا تو عوامی تاثر یہ تھا کہ پاکستان نے اپنے آپ کو Sell (Out) کیا ہے۔ بھٹو نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔" (۲۸)

یہاں ایوب خان کے اقتدار کے زوال کا بیان کرتے ہوئے ان حالات کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو اس وقت پاکستان کو درپیش تھے۔ جنرل ایوب خان نے معاہدہ تاشقند کے ذریعے جنگ بندی کر کے پاکستانی عوام کو مایوسی کی دلدل میں دھکیل دیا تھا۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر ذوالفقار علی بھٹو نے ایوب مخالف تحریک میں اور تیزی پیدا کر دی جس کے لیے عبدالمجید ملک نے جلتی پر تیل کا محاورہ استعمال کیا ہے۔ اس محاورے کا ایک اور جگہ خوب صورتی سے استعمال وہ یوں کرتے ہیں:

"ان دنوں ایک اور واقعے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ہوا یوں کہ ڈھاکہ یونی ورسٹی میں احتجاجی طلبہ پر فائرنگ کی گئی جس سے متعدد طالب علم ہلاک اور زخمی ہو گئے۔ اس واقعے کا سارے مشرقی پاکستان میں شدید رد عمل ہوا۔" (۲۹)

عبدالمجید ملک نے صورت حال کے مطابق محاورات کا استعمال کیا ہے۔ جہاں خراب اور دگر گوں حالات کے بیان کے لیے انھوں نے جلتی پر تیل اور اس طرح کے دیگر محاورات استعمال کیے ہیں وہاں انھوں نے اقتدار کے سنگھاسن پر بیٹھنے والوں کی عیش و عشرت کے بیان میں بھی محاورات سے بر محل اور بہترین کام لیا ہے۔ جنرل یحییٰ خان کے بارے میں لکھتے ہوئے وہ محاورے کا استعمال یوں کرتے ہیں:

"یحییٰ خان کی شخصیت اس طرح تھی کہ وہ بڑے ذہین، کھلے دل کے، اعتماد کرنے والے شخص تھے مگر ان کے بارے میں یہ بات سب پر عیاں تھی کہ ان کی شامیں بڑی رنگین ہوتی تھیں۔" (۳۰)

شامیں رنگین ہونا ایک عام مستعمل محاورہ ہے جس کا مطلب راتوں کو عیش و عشرت اور شباب کباب میں گزارنا ہے۔ جنرل یحییٰ خان اس کام میں بڑے طاق تھے۔ ان کے دور میں اقتدار پر بیٹھنے والوں نے خوب موجیں اڑائی تھیں جن میں یحییٰ خان خود سب سے آگے تھے۔ اس مناسبت سے عبدالمجید ملک نے یحییٰ خان کے اوصاف گنواتے ہوئے ساتھ محاورہ استعمال کر کے ان کی شخصیت کے منفی پہلو کو بھی بڑی خوب صورتی سے واضح کیا ہے جس سے تحریر میں حسن پیدا ہوا ہے۔

جنرل عبد المجید ملک کی آپ بیتی زیادہ تر ان کے فوجی زندگی کے تجربات کا بیان ہے۔ اس میں انھوں نے مختلف محاذوں پر اپنے اور پاک فوج کے کارناموں کا تذکرہ بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ یہ تذکرہ کرتے ہوئے بھی انھوں نے بعض جگہوں پر موقع محل کی مناسبت سے محاورات کا استعمال بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ انھوں نے یہاں فوج کے ادارے کی شجاعت کو بھی سامنے رکھا ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ دشمن پر کاری ضرب لگانے اور اسے شدید نقصان پہنچانے کو یوں بیان کرتے ہیں۔

"ہمارے اس غیر متوقع اور یک دم حملے سے دشمن فوج کے چھکے چھوٹ گئے۔"(۳۱)

یہاں "چھکے چھوٹ جانا" محاورے کے طور پر استعمال ہوا۔ اس محاورے نے دشمن کی شکست کے بیان کو اور زیادہ با معنی اور دلچسپ بنا دیا ہے۔

جنرل عبد المجید ملک نے اس آپ بیتی میں جو اسلوب اپنایا ہے وہ من گھڑت اسلوب نہیں ہے بلکہ ان کی زندگی میں جو واقعات ان کو درپیش آئے اور جن فرائض کی انجام دہی میں مصروف رہے اس دوران میں ان کی زبان میں ہونے والی تبدیلیاں اس اسلوب پر خاصی اثر انداز ہوئی ہیں۔ انھوں نے یہاں وہی زبان استعمال کی ہے جو ان کی روزمرہ کی بول چال کی زبان ہے۔ اس زبان کے استعمال کی وجہ سے ان کی تحریر میں بناوٹ کی بجائے اصلیت اور حقیقت کے قریب ہونے کا عنصر پیدا ہو گیا ہے۔

فوج میں عام طور پر انگریزی کا استعمال خاصا زیادہ ہوتا ہے۔ مختلف امور کی انجام دہی کے لیے زیادہ تر انگریزی زبان ہی استعمال کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بول چال میں محاورات اور ضرب الامثال بھی انگریزی کے استعمال ہونے لگتے ہیں۔ اس حوالے سے دیکھا جائے" ہم بھی وہاں موجود تھے" میں جنرل عبد المجید ملک نے انگریزی زبان کے وہ محاورات بھی استعمال کیے ہیں جو فوجی زندگی میں عام استعمال ہوتے ہیں اور جملے یا بات میں خاصا وزن پیدا کرتے ہیں۔ ایک جگہ انگریزی زبان کے محاورے کو استعمال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جنگ حکمت عملی اور منصوبہ سازی کے لحاظ سے کسی بھی آپریشن کے عین دوران میں اس کمانڈر کی تبدیلی جو کامیابی کی طرف گامزن ہو اس کی مثالیں عسکری تاریخ میں بہت کم ملتی ہیں۔ یہ عمل changing horses in the middle کے مترادف ہے۔" (۳۲)

اسی طرح جنرل ایوب خان اور بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاستری کی جسمانی ساخت کا موازنہ کرتے ہوئے وہ یوں لکھتے ہیں:

"ان دونوں میں جسمانی ساخت کا بڑا تضاد تھا جو ایک دلچسپی کا باعث بھی تھا۔ وہ یہ کہ ایوب خان ایک دراز قد اور مضبوط ڈیل ڈول کے مالک تھے جب کہ لال بہادر شاستری ایک پست قد اور نحیف آدمی تھے۔ ایوب خان اس برتری پر تفاخر کے احساس میں بھی مبتلا تھے مگر شاید انہیں یہ علم نہ تھا۔

"size does not determine the capcity to think" (۳۳)

یوں انھوں نے یہاں ایک طرف ایوب خان اور لال بہادر شاستری کی جسمانی ساخت کا موازنہ کیا ہے تو دوسری طرف انگریزی زبان کے محاورے کے ذریعے ایوب خان کی بعض نااہلیوں سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ اپنے ایسے ڈیل ڈول اور دراز قامتی کے باوجود وہ بعض معاملات میں بھارتی وزیر اعظم سے مات کھا گئے تھے۔

جنرل عبدالمجید ملک نے اس آپ بیتی میں بعض جگہوں پر ضرب الامثال کا استعمال بھی کیا ہے۔ انھوں نے بعض جگہوں پر موقع اور تحریر کی روانی کی مناسبت سے فارسی کی ضرب الامثال بھی استعمال کی ہیں لیکن یہ ایسی ضرب الامثال نہیں ہیں جو عام مشاہدے کی نہ ہوں بلکہ یہ اردو میں عام مستعمل ہونے کی وجہ سے بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ایک جگہ فارسی ضرب المثل کا استعمال یوں کرتے ہیں:

"یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اگر جنرل افتخار خان زندہ رہتے تو اس ملک کا نقشہ بالکل مختلف ہوتا مگر تدبیر کند بندہ، تقدیر زند خندہ" (۳۴)

اسی طرح ایک اور جگہ فارسی ضرب المثل کا استعمال یوں خوب صورتی سے کرتے ہیں:

> ”سکندر مرزا کا خیال تھا کہ یہ مارشل لاء ایک قلیل مدت تک رہے گا، میں اسمبلی برخاست کر دوں گا جس کے بعد میں بادشاہ وقت بن جاؤں گا مگر من درچہ خیالم و فلک درچہ خیال“ (۳۵)

یہ فارسی کی وہ ضرب الامثال ہیں جو اردو میں بھی عام مستعمل ہیں۔ ان کے یہاں استعمال سے ایک طرف تو تحریر میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی تو دوسری طرف ان کا استعمال تحریر کو معنوی وسعت بھی بڑی خوب صورتی سے عطا کر رہا ہے۔

جنرل عبدالمجید ملک کے اسلوب کی ایک بڑی خوبی ان کی تحریر کا رواں ہونا ہے۔ ان کی آپ بیتی ”ہم بھی وہاں موجود تھے“ میں کمال کی روانی پائی جاتی ہے۔ یہ روانی انھوں نے بعض جگہوں پر اشعار اور مصرعوں کے استعمال سے بھی بڑی خوب صورتی سے قائم رکھی ہے۔ انھوں نے مصرعوں کا استعمال بڑا برمحل کیا ہے۔ مصرعوں اور اشعار کا استعمال اس طرح کرتے ہیں کہ شاعری کا نثر میں ٹکڑا لگا ہوا محسوس نہیں ہوتا بلکہ قاری کو یوں ہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ یہاں پہ لگنا ضروری تھا۔ ایک جگہ وہ مصرعے کا استعمال کر کے تحریر کو یوں دلچسپ بناتے ہیں:

> ”پاکستان کے صدر سکندر مرزا جو ایک دن قبل سیاہ و سفید کے مالک تھے جس طرح بے بس ہو کر ایوان اقتدار سے نکالے گئے، کسی حد تک یہ مصرعہ ان پر صادق آتا ہے کہ:
>
> سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے“ (۳۶)

۱۹۷۱ء کی جنگ نے پاکستانی عوام اور فوج کے دلوں پر خاصا اثر کیا تھا۔ دنیا میں یہ تاثر گیا تھا کہ پاکستان کی فوج جو ۱۹۶۵ء میں دنیا کی بہترین فوج ثابت ہوئی تھی اور اس نے اپنے سے کئی گنا بڑے دشمن کو ناکوں چنے چبوا دیئے تھے اب اس میں پہلا سا دم خم باقی نہیں رہا لیکن فوج پھر بھی فوج ہوتی ہے۔ پاکستان کی فوج نے وقتی شکست کے بعد اپنی کارکردگی پر خصوصی توجہ دی اور بعد میں کئی محاذوں پر اس کے افسران اور جوانوں نے شجاعت کی داستانیں رقم کیں۔ ان میں کشمیر کے علاقے میں ہونے والی کارروائیاں بھی شامل

ہیں۔ جہاں مختلف معرکوں میں بہترین حکمت عملی سے پاک فوج نے کامیابی حاصل کی اور جب وہ کامیابیاں دنیا کے سامنے آئیں تو عالمی سطح پر اس بات کا اقرار کیا گیا کہ پاکستان کی فوج اب بھی دنیا کی بہترین فوج ہے۔ اس کا تذکرہ عبدالمجید ملک یوں کرتے ہیں:

> ''لیپا ویلی کا ایکشن اگرچہ ایک چھوٹا سا ایکشن تھا مگر اس نے بہت جلد عالمی سطح پر شہرت حاصل کر لی۔ ہندوستان والے فوراً اس ایکشن کے خلاف اقوام متحدہ میں چلے گئے جس سے اس معاملے کو ہوا ملی۔ لیکن اس کا ایک مثبت اثر یہ پڑا کہ سب کو اس کی خبر ہو گئی کہ پاکستان کی آرمی میں ابھی دم خم موجود ہے۔ بقول شاعر:
>
> بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں۔ [۳۸]

مصرعوں کے علاوہ عبدالمجید ملک نے اپنی آپ بیتی میں کہیں کہیں مکمل اشعار کا اندراج کر کے بھی ان سے خوب کام لیا ہے۔ مصرعوں کی طرح ان کا اشعار کے استعمال کا انداز بھی خاصا جاندار اور بر محل ہوتا ہے۔ اشعار ان کی تحریر میں یوں سمو جاتے ہیں کہ تحریر ہی کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ ایک جگہ اسی طرح شعر کا استعمال وہ یوں کرتے ہیں:

> ''ضیاء الحق کے علاوہ میرے سمیت کوئی بھی آرمی چیف ہوتا تو وہ بھٹو کو سزا سے تو نہ بچا سکتا مگر اس کو تختہ دار تک نہ پہنچاتا مگر یاد رہے کہ بھٹو نے اپنے دورِ حکومت میں دلائی کیمپ قائم کیے اور دیگر کئی مظالم کا سلسلہ جاری رکھا۔
>
> عدل و انصاف فقط حشر پہ موقوف نہیں
>
> زندگی خود بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے [۳۹]

یوں عبدالمجید ملک نے یہاں اس شعر کو بڑی خوب صورتی سے تحریر کا حصہ بنایا ہے اور اس امر کا ثبوت دیا ہے کہ وہ سخن فہم بھی ہیں اور اشعار کے مفہوم کی تہہ تک رسائی حاصل کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

"ہم بھی وہاں موجود تھے" کے اسلوب کی ایک اور اہم خوبی شگفتگی ہے۔ عبد المجید ملک نے بہت سی بڑی بڑی باتوں کو انتہائی شگفتہ انداز میں بیان کیا ہے جس سے تحریر کی تاثیر میں اضافہ ہونے کے ساتھ اس کے اسلوب میں روانی بھی آگئی ہے۔

جنرل ایوب نے جب اقتدار سنبھالنے کے بعد صدر سکندر مرزا کو بھی استعفیٰ دینے پر مجبور کیا تو اس واقعے کو جنرل عبد المجید یوں شگفتہ اور ظریفانہ انداز میں بیان کرتے ہیں:

> "ان تین فوجی منسٹروں نے جب ایوب خان سے دریافت کیا کہ فائل سکندر مرزا کے سامنے کون پیش کرے گا تو ایوب خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جنرل اعظم"۔ جنرل اعظم چونکہ تھوڑا سا اونچا سنتے تھے اس لیے ایوب خان نے اس بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ جنرل اعظم کی خوبی یہ ہے کہ یہ وہی سنتے ہیں جو سننا چاہتے ہیں۔" (۴۰)

یہاں جنرل اعظم کی معذوری کو سکندر مرزا کے استعفیٰ والے واقعے سے بڑی خوب صورتی سے جوڑا گیا ہے کیونکہ سکندر مرزا سے استعفیٰ ہر حال میں لینا تھا اور ان کی طرف سے انکار فوجی حکمران سننا نہیں چاہتے تھے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنرل عبد المجید ملک کی خود نوشت "ہم بھی وہاں موجود تھے" کے فنی اور اسلوبیاتی محاسن کمال کے ہیں۔ انہوں نے مختلف تجرباتِ زندگی کو بڑی خوب صورتی سے کڑی سے کڑی ملاتے ہوئے بیان کیا ہے اور اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ کہیں بھی کوئی جھول متن میں نہ پڑنے پائے۔ اس کے علاوہ انہوں روایتی محاسن تشبیہہ، استعارہ، محاورات اور اشعار کا استعمال بھی بڑی خوب صورتی سے کیا ہے جس کی وجہ سے ان کی یہ خود نوشت فکری اور فنی دونوں حوالوں سے ادب میں خاص اہمیت کی حامل قرار پاتی ہے۔

## د: "فرزندِ پاکستان" اور "ہم بھی وہاں موجود تھے" کے فن اور اسلوب کا تقابل:

آپ بیتی کے فن اور اسلوب کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے "فرزندِ پاکستان" اور "ہم بھی وہاں موجود تھے" کے فن اور اسلوب کا تقابل کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ دونوں آپ بیتیوں میں ان فنی اور اسلوبیاتی تقاضوں کو کافی حد تک مد نظر رکھا گیا ہے۔ ان دونوں آپ بیتیوں کے مصنفین کا تعلق پاکستان کی سیاست سے خاصا گہرا ہے جس کی وجہ سے ان آپ بیتیوں میں سیاسی عناصر کا عمل دخل خاصا نظر آتا ہے۔ ان دونوں آپ بیتیوں کے فنی اور اسلوبی خصائص کافی حد تک یکساں ہیں لیکن بعض امور میں دونوں آپ بیتی نگاروں کی اپنی اپنی انفرادیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔

فرزندِ پاکستان کے مصنف شیخ رشید احمد کا تعلق شروع سے ہی سیاست سے ہے۔ ان کی آپ بیتی میں زیادہ جھلک سیاسی تجربات کی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آپ بیتی میں فنی حوالے سے استعمال کی گئیں اصطلاحات، تشبیہات اور استعارات وغیرہ بھی سیاسی نوعیت کے ہیں۔ ان کے ہاں سیاست دانوں کی زبان کا جیسا جوش و خروش اور سرمستی ملتی ہے جب کہ عبدالمجید ملک نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ فوج میں گزارا ہے۔ بعد میں وہ بھی سیاست میں شامل ہوئے لیکن زندگی کا بہترین حصہ جس میں انھوں نے کھل کر اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا وہ ان کی فوجی زندگی ہے۔ اس زندگی کے تجربات اور مشاہدات بیان کرتے ہوئے انھوں نے ایسی تشبیہات اور استعارات وغیرہ استعمال کیے ہیں جن میں جوش و خروش کی بجائے جواں مردی، ہمت اور بہادری کا عمل دخل ملتا ہے۔

زبان و بیان کے حوالے سے دیکھا جائے تو "فرزندِ پاکستان" میں سیاسی زبان زیادہ استعمال ہوئی ہے۔ سیاست دانوں کا لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے اور ان کو سبز باغ دکھانے کے لیے دعوے کرنے کا جو انداز ہوتا ہے وہ انداز فرزند پاکستان میں ملتا ہے جب کہ "ہم بھی وہاں موجود تھے" میں ایسے دعوے کرنے والے انداز کی بجائے انتہائی پختہ انداز اور سنجیدہ بحث ملتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ

دونوں مصنفین کا تعلق ایسے شعبوں سے رہا ہے جو آپس میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ سیاست میں زبان کے جوہر چلتے ہیں تو فوج میں ہمت اور جوان مردی۔ یہی دونوں ان آپ بیتیوں کے اسلوب میں واضح فرق کرتے ہیں۔

''فرزند پاکستان'' اوز ''ہم بھی وہاں موجود تھے'' کے اسلوب میں ایک واضح فرق ان دونوں آپ بیتیوں میں بیان کیے گئے واقعات کی وجہ سے پیدا ہونے والے تاثر کے حوالے سے ہے۔ اس کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ شیخ رشید احمد کی آپ بیتی '' فرزند پاکستان'' زیادہ تر سیاسی تجربات اور سیاسی واقعات پر مشتمل ہے۔ پاکستان کی سیاست میں آنے والے اتار چڑھاؤ اور بے ربطی کا احساس اس آپ بیتی کے اسلوب میں بھی ہوتا ہے۔ اس آپ بیتی میں مختلف واقعات کا آپس میں ربط اس درجے کا نہیں جیسا عبدالمجید ملک کی آپ بیتی '' ہم بھی وہاں موجود تھے'' کا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ عبدالمجید ملک کا تعلق چونکہ فوج سے تھا اور فوجی زندگی میں جو ربط اور نظم وضبط ہوتا ہے وہ عام زندگی میں نہیں ہوتا اور سیاسی زندگی تو ہوتی ہی افراتفری پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عبدالمجید ملک کی آپ بیتی پر ان کی فوجی زندگی کے اثرات واضح دکھائی دیتے ہیں اور تقریباً ایک صدی کے واقعات پر مشتمل اس آپ بیتی میں مختلف واقعات کے بیان میں کہیں بھی بے ربطی یا جھول دکھائی نہیں دیتا۔

شیخ رشید احمد کی آپ بیتی '' فرزندِ پاکستان'' میں روانی اور جوش ملتا ہے جب کہ عبدالمجید ملک کی آپ بیتی '' ہم بھی وہاں موجود تھے'' میں روانی اور ٹھہراؤ ملتا ہے۔ وہ شیخ رشید احمد کی طرح سب کچھ ایک ہی انداز میں کہہ دینے کے عادی نہیں بلکہ جس جملے یا واقعہ کو جس انداز میں بیان کرنا ضروری ہو وہی اندا زاپناتے ہیں۔ ان کے ہاں اگر کہیں مزاح کا عنصر بھی اسلوب میں شامل ہوا ہے تو وہ بھی پھکڑپن یا دروغ گوئی کا حامل نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں سنجیدہ مزاح بنا کر ابھرا ہے۔

مجموعی طور دونوں آپ بیتیاں اسلوب اور فن کے حوالے سے خاصی کامیاب آپ بیتیاں ہیں۔ ان میں اسلوب کی سطح پر جو فرق پایا جاتا ہے اس میں زیادہ عمل دخل ان دونوں آپ بیتیوں کے مصنفین کی ذاتی زندگی کے اثرات کی وجہ سے ہے۔

# حوالہ جات


۱۔ The Concise Oxford Dictionary, Oxford University Press, Great Britain, 1982 , p . 1059

۲۔ New Webster,s Dictionary of English Language , The Delair Publishing Company , USA, 1986 , p 973

۳۔ شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد،۲۰۰۸ء)، ص۴۸

۴۔ نورالغات، نیشنل بک فائونڈیشن، اسلام آباد،۲۰۰۶ء، ص۳۱۱

۵۔ فیروزالدین مولوی، فیروز اللغات، اردو جامع نیا ایڈیشن فیروز لیمیٹڈ، لاہور،۲۰۱۴ء، ص۹۱

۶۔ فرہنگ عامرہ، ٹائمز پریس، کراچی،۱۹۵۷ء، ص۳۶

۷۔ اظہر الغات، اظہر پبلی کیشنز، لاہور،۱۹۹۴ء، ص۸۱

۸۔ گلزار معانی، گلزار عالم پریس، لاہور،۱۹۶۷ء، ص۱۰۰

۹۔ جامع الغات، جلد اوّل، جامع الغات کمپنی، لاہور۔ س۔ن۔ ص۱۹۷

۱۰۔ ابو الا عجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول، ۱۹۸۵ء، ص۱۳

۱۱۔ گوپی چند نارنگ، ادبی تنقید اور اسلوبیات، سنگ میل پبلی کیشنز، راولپنڈی،۱۹۹۱ء، ص۱۴

۱۲۔ ”اوراق“ سالنامہ، جنوری۔ فروری۱۹۷۶ء، جلد ۱۲، شمارہ ۲،۱

۱۳۔ عابد علی عابد، سید، اسلوب، مجلس ترقی ادب، دسمبر ۱۹۷۱ء، ص ۴۱

۱۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی دبستان، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص ۲۱۲

۱۵۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اردو ناول، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۸ء، ص ۸۵

۱۶۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء، ص ۲۳

۱۷۔ رشید احمد شیخ، فرزند پاکستان، رمیل پبلی کیشنز ہاؤس آف راولپنڈی، ۲۰۱۳ء، ص ۱۶۳

۱۸۔ ایضاً ص ۱۶۳

۱۹۔ ایضاً ص ۱۵۶

۲۰۔ ایضاً ص ۱۵۲

۲۱۔ ایضاً ص ۱۰۸

۲۲۔ عبدالمجید ملک، ہم بھی وہاں موجود تھے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۴۹

۲۳۔ ایضاً ص ۷۵

۲۴۔ ایضاً ص ۶۴

۲۵۔ ایضاً ص ۵۶

۲۶۔ ایضاً ص ۵۷

۲۷۔ ایضاً ص ۷۳

۲۸۔ ایضاً ص۹۵

۲۹۔ ایضاً ص۱۰۸

۳۰۔ ایضاً ص۱۱۲

۳۱۔ ایضاً ص۱۱۷

۳۲۔ ایضاً ص۸۶

۳۳۔ ایضاً ص۸۷

۳۴۔ ایضاً ص۶۸

۳۵۔ ایضاً ص۷۰

۳۶۔ ایضاً ص۷۸

۳۷۔ ایضاً ص۷۸

۳۸۔ ایضاً ص۱۳۰

۳۹۔ ایضاً ص۱۵۶

۴۰۔ ایضاً ص۷۷

# باب پنجم:

# ماحصل

## الف: مجموعی جائزہ:

"فرزند پاکستان" از شیخ رشید احمد اور "ہم بھی وہاں موجود تھے" از لیفٹیننٹ جنرل (ر) عبدالمجید ملک ملکی سیاسی منظر نامے کی تاریخ بیان کرنے والی دو اہم دستاویزات ہیں۔ ان دستاویزات میں سیاسی، سماجی اور لسانی پہلو اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

دونوں سیاسی شخصیات ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں غیر جماعتی بنیادوں پر منتخب ہونے والے نمائندوں میں سے ہیں۔ اگرچہ یہ دور مارشل لاء کا تھا۔ مگر اس دور میں متعارف ہونے والے سیاست دان مستقبل میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں اور ماضی کی کوتاہیوں سے پوری طرح باخبر تھے۔ جنرل عبدالمجید ملک ایک خالص فوجی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ جنھوں نے فوج میں تجربہ حاصل کرنے کے بعد سیاست کی وادی میں قدم رکھا۔ دوسری جانب شیخ رشید احمد بچپن سے ہی سیاست کے میدان میں لگاؤ رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے کسمپرسی کے عالم سے اٹھ کر کئی دفعہ وزارت کے عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ دونوں سیاسی شخصیات پہلی بار ایک ہی جماعت کے بر سر اقتدار میں آنے کے بعد کابینہ میں شامل تھے۔ ان دونوں سیاسی شخصیات نے اپنے سیاسی سفر نامے میں مختلف اوقات میں مختلف سیاسی جماعتوں میں شمولیت اختیار کی۔ جنرل عبدالمجید ملک اس دار فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔ ۲۰۰۱ء میں مسلم لیگ (ق) میں شمولیت اختیار کی مگر ۲۰۱۳ء میں دوبارہ مسلم لیگ (ن) میں شامل ہو گئے اور اس کے بعد تادم آخر مسلم لیگ نواز شریف کے سرگرم رکن رہے۔

دوسری جانب شیخ رشید احمد اپنے سیاسی نظریات میں تبدیلی لاتے ہوئے دیگر جماعتوں کے ساتھ میل جول رکھنا پسند کیا اور بالآخر اپنی سیاسی جماعت عوامی مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اپنی بات ملک کے گوشے گوشے میں پہنچارہے ہیں۔ دونوں سیاسی شخصیات کی آپ بیتیوں میں فرق ہے۔ مگر ایک خطے کے باسی ہونے کی وجہ سے عادات، خصائل زبان اور دیگر اوصاف انہیں ایک دوسرے کے قریب کرتے ہیں۔ جیسا کہ بعض اوقات یکساں خیالات اور بہت زیادہ مماثلت کے سبب بھی ایک دوسرے سے دوریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور ایک ہی گھر رہنے والے ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ دونوں آپ بیتیوں کے مطالعہ ہمیں سیاسی منظر نامے کے علاوہ دونوں شخصیات کے مزاجوں میں فرق کا واضح پتہ چلتا ہے۔ سیاست ایک ایسا شعبہ ہے جہاں عمل کے ساتھ ساتھ الفاظ کے ذریعے عوام تک ان اقدامات کی رسائی زیادہ اہمیت رکھتی ہے اس حوالے سے تو پوری پاکستانی سیاست کی تاریخ میں شیخ رشید احمد ان گنی چنی شخصیات میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اپنی زبان اور اپنے خطابانہ جوہروں کی بناء پر عوامی ترجمانی کرنے اور اسے منظر عام پر لانے میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ مگر دوسری جانب عبدالمجید ملک فوج سے سبکدوش ہونے والے بڑے جرنیلوں میں سے تھے۔ اس لیے اپنے سیاسی کیریئر کے دوران اپنی فوجی ملازمت سے پوری زندگی پیچھا نہ چھڑا سکے اور ایک عملیت پسند آدمی کی نہایت کم گو ثابت ہوتے تھے۔

سیاست میں حادثاتی طور پر وارد ہونے والے جنرل عبدالمجید ملک نے چکوال میں مقامی سرداروں کو شکست دے کر انہیں اپنے حقیقی نمائندہ ہونے کا احساس دلایا۔ ان کی کتاب میں ان کا دھیما مزاج اور عملیت پسندی کے واقعات مفصل نظر آتے ہیں۔ شیخ رشید احمد بھی ان کی مانند ہیں جنھوں نے نہایت قلیل وسائل کے ساتھ نہایت قد آور اور بااثر سیاستدانوں کو کئی دفعہ شکست فاش سے دوچار کیا۔ البتہ اپنی روایتی بے باکی کے سبب کئی دفعہ مشکلات کا شکار رہے۔ مثلاً تحریک نجات میں پورے ملک کے طول و عرض میں پیپلز پارٹی کی بدعنوان حکومت کے خلاف ان جوشیلی تقریروں کی وجہ سے انہیں قید وبند کی صعوبتوں سے بھی گزرنا پڑا۔

دونوں تصانیف میں سیاسی شعور کا غلبہ سماجی شعور سے زیادہ ہے۔ ظاہر ہے سیاسی شعور میں اضافے کے لیے سماج کا بہتر مشاہدہ اور مطالعہ ایک عام انسان کو کامیاب سیاستدان میں بدل سکتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو سیاسی اور اقتصادی معاملات میں شیخ رشید احمد کی گرفت زیادہ مضبوط دکھائی دیتی ہے۔ مگر دوسری جانب پاکستانی سیاست پر عبدالمجید ملک کے سیاسی شعور اور تاریخی فہمی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ شیخ رشید احمد جہاں عوامی نفسیات اور جذبات کتاب کے ذریعے قارئین تک پہچایا ہے۔ تو عبدالمجید ملک کے سیاسی تجربے اور ان کی بردبار شخصیت اور سیاسی تاریخ پر ان کی گہری نظر کے غماض ہیں۔

وہ دھیمے اور پر اثر لہجے میں بات کرتے ہیں۔ لیکن جب وہ بات پوری ہو جاتی ہے تو بات کے کہنے میں جو دلائل اور مشاہدہ کار فرما ہوتا ہے وہ کسی عام اور خاص ہر انسان کو قائل کر لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دونوں آپ بیتیوں کا مطالعہ اس بات کو بھی آشکار کرتا ہے کہ عوام میں رہنے کی وجہ سے شیخ رشید احمد عوامی مسائل کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھتے ہیں اوران کے حل کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ جبکہ عبدالمجید ملک کی آپ بیتی ملکی سیاست کے ساتھ ساتھ عالمی معاملات اور ان میں پاکستان کے کردار کو واضح کرتی نظر آتی ہے۔

شیخ رشید احمد کی آپ بیتی سماجی منظر نامے کی مکمل تصویر پیش کرتی ہے۔ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ سماج میں رہنے کی وجہ سے اور لوگوں میں میل جول کی وجہ سے انہیں نفسیات پر اس قدر عبور حاصل ہو چکا ہے کہ وہ مسائل کو سمجھتے ہوئے عوام کے ذہنوں میں جھانکنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ سماج کا یہ مطالعہ ہی ان کی پے درپے سیاسی کامیابیوں کی بڑی دلیل ہے۔ دوسری جانب عبدالمجید ملک جنگ اور امن کی حالت میں فوج میں طویل عرصہ خدمات دے چکے ہیں۔ اس وجہ سے وہ جنگ کے اثرات اور بھوک، ناانصافی اور قتل غارت گری کے اثرات کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ سیاست میں ان کی آمد کا بنیادی مقصد ایک ایسے پلیٹ فارم کی آڑ لینا جس کی مدد سے وہ حکومتی زعما کو علاقے اور ملک کے حوالے بہتر مشورے دے سکیں۔ لہٰذا قومی اسمبلی کا پلیٹ فارم ان کے لیے زیادہ بہتر تھا۔ اپنے رکن قومی اسمبلی ہونے کے دوران وہ عوام اور حکومت کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کرنے کی پوری کوشش کرتے رہے۔ لیکن فوجی زندگی میں سیکھی گئی چند باتیں ساری عمر ان کا پیچھا کرتی رہیں۔ مثلاً نظم وضبط کا خیال رکھنا۔ سیاست میں خود نمائی سے گریز کیا اور خالصتاً قومی جذبے سے سرشار رہے۔ یہ سب ان کی تصنیف میں نظر آتا ہے۔

"فرزند پاکستان" اور "ہم بھی وہاں موجود تھے" جیسی آپ بیتیوں پر بات کرنے کے لیے ان کتب کا مطالعہ زیادہ ضروری ہے جو پوٹھوہاری سماج کے بارے میں زیادہ بہتر اور حقیقت پسندانہ تبصرہ کرے۔ ان دونوں آپ بیتیوں میں زبان کا استعمال دونوں شخصیات کے تصور اور زندگی فلسفے سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہ بات عام طور پر کہی اور سمجھی جاتی ہے کہ انسان اپنے کردار اور عمل سے پہچانا جاتا ہے۔ لیکن زبان ایک ایسا آلہ ہے جس کی مدد سے انسان کی شخصیت کی پوری تصویر کشی ممکن ہے۔

ان دونوں آپ بیتیوں کے لسانی پہلوؤں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نے اپنے اپنے مزاج کے مطابق الفاظ اور اصطلاحات کو برتا۔ جنرل عبد المجید ملک نے اپنے سیاسی اور فوجی کیرئیر کے متعلق معلومات کی فراہمی کے لیے انتہائی آسان زبان استعمال کی ہے۔ مگر ابواب بندی میں سیاسی سفارتی اور فوجی زندگی کے متعلق ابواب الگ الگ نظر آتے ہیں۔ ان کا بغور جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی فوجی زندگی میں سپاٹ سلیس اور خالص فوجی زبان کے استعمال کو اہمیت دی ہے۔ سفارتی زندگی سے متعلق باب میں پاکستان کے دوسرے ممالک سے روابط سے متعلق بات کی گئی ہے۔ یہ کس قدر بیانیہ اور مفصل ہے۔ مگر اپنی سیاسی زندگی کے دوران حاصل کامیابیوں اور ناکامیوں کا ذکر مفصل انداز میں کیا گیا ہے اور انتخابی مہموں کے دوران معروف نغموں اور اشعار کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔ کتاب کے تمام حصوں کی زبان ایک پر وقار دھیمی اور مبالغے سے دور ایک خوبصورت داستان کی مانند نظر آتی ہے۔ شیخ رشید احمد کی تصنیف میں بچپن سے لے کر ۱۹۹۵ء تک کے حالات کی تصویر کشی ان کے مخصوص مزاج کے مطابق نظر آتی ہے۔ حالات وواقعات کی پیش کش ان کی اپنی بلاچیز شخصیت کے مطابق تیز تر ہے۔ واقعات کا تسلسل اور روانی نہایت تیز ہے۔ مگر اپنی ذہانت اور یادداشت کے سبب وہ واقعات کے اہم جز بیان کر دیتے ہیں اور اس میں سیاسی اور معاشرتی مصلحت کا شکار نہیں ہوتے۔

الغرض دونوں شخصیات نے اپنے اپنے تجربات اور مشاہدات کو الفاظ کی صورت دے کر اسے عوام الناس تک پہنچانے کے لیے اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور دونوں نے اپنے خاندانی پس منظر اور طبیعت کے مطابق الفاظ اور واقعات کے چناؤ میں حکمت سے کام لیا ہے۔ دونوں کا انداز مختلف مگر مقصد ایک ہے دونوں شخصیات سیاست کے پلیٹ فارم کو استعمال کرتے ہوئے عوامی خدمت اور عوام کے مسائل کے بہتر حل کی کوششوں میں تجویز دیتے نظر آتے ہیں۔

## ب: نتائج:

۱۔ پاکستانی سیاست دانوں کی آپ بیتیوں سے مکمل آگاہی ہوتی ہے اور ان کے طرز سیاست اور مختلف شخصیات کی سیاسی جدوجہد اور ان کے سیاسی عہد سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

۲۔ "فرزند پاکستان" اور "ہم بھی وہاں موجود تھے" ان دونوں آپ بیتیوں کے منصفین کا ایک ہی سیاسی عہد اور ایک خطہ ہونے کی وجہ سے جہاں بہت سے واقعات میں اتفاق رائے پایا جاتا ہے وہاں اختلاف رائے بھی موجود ہے۔ اس طرح انداز بیان میں جہاں دونوں نے عام فہم زبان کو استعمال کیا ہے۔ وہاں بھی ان کا اپنا ایک مخصوص انداز پیشہ وارانہ طور پر پایا جاتا ہے۔ ان آپ بیتیوں کے مطالعے سے تاریخی غلطیوں کا ادراک ملتا ہے اور معاشرت میں ہونے والی تبدیلیوں کا شعور بھی ملتا ہے۔

۳۔ ملک کے سیاسی، سماجی حالات و واقعات کو دونوں شخصیات نے وسیع النظری سے دیکھا ہے اور مسائل کے حل کیلئے گراں قدر خدمات اور تجاویز پیش کی ہیں اور ان آپ بیتیوں کے مطالعے سے ملکی سیاست کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

## ج: سفارشات:

۱۔ سیاسی شخصیات کی آپ بیتیوں کے تحقیقی و تنقیدی جائزے پر کام کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ پاکستانی سیاسی آپ بیتیوں کا دیگر ممالک کی سیاسی آپ بیتیوں سے سیاسی، سماجی اور تہذیبی و تمدنی تقابل کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ ان سیاسی آپ بیتیوں کا ان کے ہم عصر سیاست دانوں کی آپ بیتیوں سے اسلوبیاتی تقابل کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ سیاسی آپ بیتیوں کے تجزیاتی مطالعے پر بھی کام کیا جاسکتا ہے۔

# کتابیات

## بنیادی ماخذ:

رشید احمد، شیخ، فرزند پاکستان، رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۳ء

عبد المجید، ملک، ہم بھی وہاں موجود تھے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۱۰۵ء

## ثانوی ماخذ:

ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اوّل، ۱۹۸۵ء

انصاری، یوسف جمال، آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں، مشمولہ نقوش، آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۴

ایم اے چودھری، مارشل لاء کا سیاسی انداز، جنگ پبلشرز پریس، اوسر آغا خان روڈ، لاہور، ۱۹۸۸ء

پروفیسر آرتھر مارشل، مشمولہ: سوزن بیسنٹ، تقابلی ادب: ایک تنقیدی جائزہ، مترجم توحید احمد یورپ اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء

تقی الدین، حافظ، پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور تحریکیں فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۵ء

حسن عسکری رضوی، پروفیسر، ملٹری اینڈ پالٹکس، بحوالہ پاکستان ایک عمومی مطالعہ، از ڈاکٹر محمد اعظم چوہدری، وفاقی اردو یونیورسٹی، کراچی، ۲۰۰۴ء

ڈیگارس، بحوالہ اسلام آباد سندیلوی، ماحول اور مزاج، سفینہ ادب، لاہور، س۔ن

رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اصناف ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء

ریاض احمد، شیخ، پاکستان، جمہوریت اور فوجی مداخلتیں، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء

سالک علم الدین، آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو، مشمولہ: نقوش آپ بیتی نمبر ادارہ فروغ ادب اردو، لاہور، ۱۹۶۴ء

سرور آل احمد، خواب باقی ہیں، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۴ء

سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی دبستان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء

سلیم اسد، شیخ، ہماری دستوری تاریخ، ۱۶۰۰ء سے ۲۰۱۸ء تک، فکشن ہاؤس، لاہور، اشاعت دوم، ۲۰۱۸ء

سوزن بیسنٹ، تقابلی ادب ایک تنقیدی جائزہ، مترجم توحید احمد، یورپ اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء

شاہد صفدر، دھن دھرتی، ڈیٹا لنک، ولی سینٹر، بلیو ایریا، اسلام آباد، اشاعت اول، اپریل ۱۹۹۲ء

صفدر احمد، ڈاکٹر، پاکستان تاریخ وسیاست، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء

ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر، داستان تاریخ رپورتاژ نگاری، ادارہ علم و فن، پشاور، ۱۹۹۹ء

عابد علی عابد، سید، اسلوب (لاہور: مجلس ترقی ادب، دسمبر ۱۹۷۱ء)

عبد المجید قریشی، آپ بیتی اردو ادب میں مشمولہ سہ ماہی، الزبیر، آپ بیتی نمبر، اردو اکادمی، بہاولپوری، ۱۹۶۴ء

علی حسنین نقوی، سید، ترقی پسند اردو نثر کے پچاس سال، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء

فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، تذکرہ نگاری کا فن اور اردو شعراء کے تذکرے، مشمولہ اردو ادب کی فنی تاریخ، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء

فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، اسلام آباد: یورپ اکادمی، ۲۰۰۷ء، گوپی چند نارنگ، ادبی تنقید اور اسلوبیات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء

لیسنگ (قول) مشمولہ: مغرب کے تنقیدی اصول، سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع ہفتم، ۲۰۱۲ء

مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ جمہوریت، تاریخ پبلیکشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء

مجاہد حسین، پاکستان بد عنوانی کی حکمرانی نگارشات، پبلشر، لاہور، ۲۰۱۶ء

محمد امجد عابد، ڈاکٹر، عصری شعور کی اصطلاح اور اردو تنقید، مشمولہ: زبان وادب، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۶ء، شمارہ ۱۹، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

محمد طفیل، تصریحات، نقوش، آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۴ء

مشفق خواجہ، مختصر آپ بیتیاں، سہ ماہی، الزبیر، آپ بیتی نمبر بہاولپور، شمارہ ۷، ۱۹۶۷ء

ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اردو ناول، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۸ء

ندیم احمد، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں خود نوشت سوانح عمری، مشمولہ خدا بخش لائبریری، جرنل ٹپنز، شمارہ ۱۲۹، جولائی ۲۰۰۲ء

وہاج الدین علوی، ڈاکٹر، خود نوشت فن و تجربہ، جامعہ خلیہ اسلامیہ دہلی، ۱۹۸۹ء

## لغات

اظہر الغات، اظہر پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء

جامع اردو لغت، مولف وارث سرہندی، علمی کتب خانہ، طبع سوئم، ۲۰۰۳ء

جامع اللغات، جلد اوّل، جامع اللغات کمپنی، لاہور، س۔ن

شان الحق حقی، مرتبہ: فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان (طبع سوم)، ۲۰۰۸ء

فرہنگ آصفیہ، مرتبہ: مولوی سید احمد دہلوی، جلد سوئم، اردو سائنس بورڈ، لاہور، باراول، ۱۹۸۶ء

فرہنگ عامرہ، ٹائمز پریس، کراچی، ۱۹۵۷ء

فیروزالدین مولوی، فیروز اللغات، اردو جامو نیا ایڈیشن، فیروز لمیٹڈ، لاہور، ۲۰۱۴ء

قومی انگریزی، اردو لغت، مولف ڈاکٹر جمیل جالبی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول، ۱۹۹۲ء

نور اللغات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء

Urdu English Dictionary (Revised Edition) Ferozsons (PVT) LTd, ۱۹۹۱ء

The Penguin Dictionary of Literary terms and literary theory, Fourth Edition, J. A. Cuddon, ۱۹۹۸ء

The Concise Oxford Dictionary, Oxford University Press, Great Britain, ۱۹۸۲ء

New Webster,s Dictionary of English Language , The Delair Publishing Company , USA, ۱۹۸٦ء

Webistor English Dictionary London,۱۹۳۴ء

## رسائل واخبارات:

اوراق، سالنامہ، جنوری۔فروری ۱۹۷٦ئ، جلد ۱۲، شمارہ ۱،۲

انور شعور، روزنامہ جنگ، راولپنڈی، ہفتہ ۱۰ مارچ ۲۰۱۲ء

## ویب سائٹس:

http//www.merriam.wbster.com/dictionary/Politics, Dec-2001, 3:00 PM.

http//www.Jass(Just accociates) info @ Justassociates.org Political Consciousness: A Perpertual Quest by Valerie Miller, 31-May-2002, 5:00 PM